

DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222941

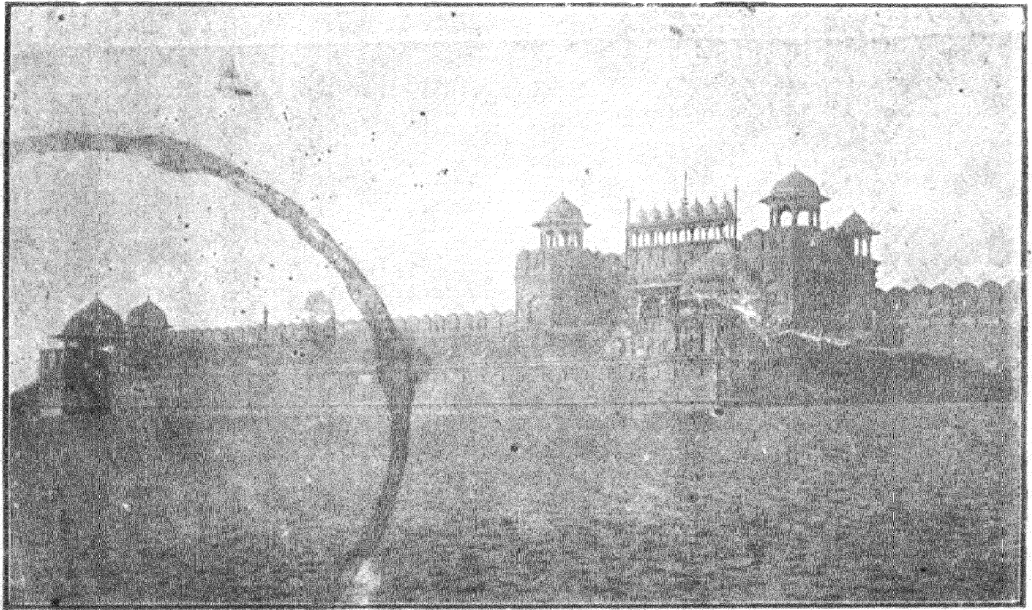
UNIVERSAL
LIBRARY

جلد دوم

بابت جنوری ۱۹۲۲ء

حصہ پنجم

اردو



انجمن ترقی اردو

کا

ستہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ پنج مقصود	جناب لوی سید غلام نیر دانی مقام لے ایم اے لکھنؤ ناظم انا قیدیہ حید آباد دکن	۱
جزو اول تاریخی	جناب لوی عبدالحی مصباحی لے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو	۱۳
جزو دوم ادبی	جناب لانا حبیب الرحمن صاحب شہروانی صدر الصداق امور مہدی دکن آنفنیہ حید آباد دکن	۳۴
تبصرہ بر تذکرہ شعرا مؤلفہ میر حسن دہلوی	جناب لوی سید ہاشمی مصباحی رکن اراثر عثمانیہ یونیورسٹی	۶۹
لارڈ میکالے کی یادداشت مسئلہ تعلیم پر	جناب لوی سید حیدالدین صاحب سکیم پرنسپل اُردو عثمانیہ کالج حید آباد دکن	۸۵
تلیحات	جناب لوی سید ہاشمی مصباحی رکن اراثر عثمانیہ یونیورسٹی	۱۳۱
یاسمین	جناب ثبوت جتوئی پرنسپل عثمانیہ کالج دہلوی	۱۳۳
ہندی شاعری نمبر ۱	جناب سید احمد علی صاحب مدرس رشتہ دستانہ بنفینہ ضلع ناٹ پور	۱۵۳
اصلاح رسم الخط	جناب لوی عبدالحی مصباحی لے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو	۱۶۴
اصطلاحات علمیہ (زبات)		۱۶۳
تبصرہ		

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

جزء اول تا سحر

از

جناب مولیٰ سید غلام زیدانی متا ایم لے۔ ایم آر۔ لے۔ ایں ناظم آثار قدیمہ آباد دکن

سلطان محمد قطب شاہ

بانی شہر حیدرآباد

نسب | تیرھویں صدی عیسوی میں جب ہلاکو کی ترک تاز نے بغداد کی سلطنت کا شیرازہ بکھردیا۔ تو تاتاری قبیلے
ہری دل کی طرح ایشیا کو چمک تک پھیل گئے۔ ان میں سے ایک قبیلے نے جلاثر خاندان کی امداد سے آرمینیا اور
آذربائیجان میں خود مختار حکومت قائم کی۔ اور رفتہ رفتہ ایسا زور پکڑا کہ پندرھویں صدی کے آغاز میں بغداد پر تسلط
حاصل کر لیا۔ یہ قبیلہ تاریخ میں آق قویونلو کے نام سے مشہور ہے۔ ترکی میں قونیو مینڈے کو کہتے ہیں۔ اور آق سیاہ
زنگ کے واسطے استعمال ہوتا ہے۔ چون کہ اس خاندان کے فوجی جھنڈے پر سیاہ مینڈے کی تصویر تھی اس لئے یہ
لقب مشہور ہو گیا۔ دکن کی قطب شاہی سلطنت کا بانی اسی خاندان سے تھا۔

الہ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ پر جو اردو کائناتِ قدیم مرتب کلام ہے میں تبصرہ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کلام پر تبصرہ لکھنے سے قبل یہ ضرور
مشاعر اور اس کے زمانہ کے حالاتِ ناظرین کو متعارف کیا جائے۔ میں اپنے مؤرخ دوست اور شفیق مولیٰ سید غلام زیدانی متا ایم لے ایم آر
لے ایں ناظم سرشتہ آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد دکن کا ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ حقہ لکھ کر مجھے بہت بڑی فکر و محنت بچا دیا۔ سید صاحب موصوف
کی نظر تاریخ میں بہت وسیع ہے اور خصوصاً خاندانِ قطب شاہیہ کے تودہ جیدہ مؤرخ ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی تحریر کو اپنے مضمون کا مقدمہ بنالیا

بانی خاندان کے دکن | آق قویلو خاندان کا ستارہ کچھ زیادہ عرصہ عروج پر نہ رہا چنانچہ بغداد میں حکمرانی کرتے ہی
میں آنے کے وجہ | نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ تاتاری نسل کے ایک اور خاندان نے جن کے پرچم پر سفید پتھر
کی تصویر تھی 'سیاہ فینڈے' والوں کو سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ اور ان کے رئیس کو ایسا تنگ کیا کہ اُس کو اپنی جان
کے لالے پڑ گئے اور جاگ کر جا بجا پناہ گزین ہونا پڑا۔

دکن میں اس وقت بہمنیہ سلاطین بادشاہی کر رہے تھے۔ ان کی داد و دہش قدر دانی کمال اور دربار کی
شان و شکوہ کا شہرہ بلادِ اسلامیہ میں پہنچ چکا تھا۔ علم و فضل کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ شعراء قصائد پڑھتے تھے۔ اور
منہ ناگی مرادیں پاتے تھے۔ اگر فرشتہ کی روایت صحیح ہو تو حافظ شیرازی کو بھی محمود شاہ بہمنی کی سخاوت اور
علم دوستی نے دکن آنے پر مائل کر دیا تھا۔ اور وہ شیراز سے روانہ ہو کر لار کے راستہ ہر مز تک آئے۔ لیکن بدعنوان
اور سمندر کے ملاح نے شاعر کے دل کو ایسا دہلایا کہ جہاز سے اتر کر وطن واپس چلے گئے اور یہ غزل میر فیض اللہ
انجو کو جن کی معرفت دربار میں طلب کیے گئے تھے لکھ کر بھیج دی

غزل

دے باغم بسر بردن جہاں کیسہ زنی ارزد بے بفروش دلق ما کزین بہر زنی ارزد
بکوسے مرفود شانش بہ جامی برنی گیرند زہے سجادہ تقویٰ کہ یک ساغر زنی ارزد
رقیم سرزنشہا کرد کزین باب بنج بر تاب چہ افتاد این سر مارا کہ خاک در زنی ارزد
بس آساں می نمود اذل غم دریا بوی سود غلط گفتم کہ یک موش بعد گوہر زنی ارزد
شکوہ تاج سلاطانی کہ بیم جان در موج ست کھاہ دل کش ست آتا بہ ترک سر زنی ارزد
نشو این نقش دل نگی کہ در بازار یک نگی بہ نعمت ہے گوناگوں مٹو احر زنی ارزد

چو خاک و در قناعت کو ش از دنیا دوں بگو

کہ یک جو منت دناں بعد من زنی ارزد

طوائف الملوک کی کثرت کی وجہ سے اس زمانہ کے شاہی درباروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر بادشاہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱) گزائوں نے کچھ ایسی خوبی سے لکھا ہے کہ وہ اصل مضمون پر چھایا ہے اور اصل مضمون اس کا قطعی ہو گیا ہے۔ (اڈیشا)

کی محبت میں بگڑے ہوئے رؤسا اور نو عمر شاہزادوں کا مجمع رہتا تھا۔ سلاطین اغراز خاندانی کے خیال سے ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور اپنے جلو میں رکنا باعثِ تُو زک و شان سمجھتے تھے۔ ذاتی جوہر اور لیاقت کے موافق مناصبِ جلیلہ بھی عطا فرماتے تھے۔ سلطان قلی بانی خاندانِ قطب شاہیہ کے دکن آنے کے متعلق مورخین نے رنگا رنگ کی روایتیں لکھی ہیں۔ کہیں بزرگانِ دین کی پیشین گوئیاں نقل کی ہیں، کہیں خوابوں کی تعبیر بیان کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اول تو جان بچانے کا خیال درپیش تھا دوسرے سیاحوں سے دکن کے بادشاہوں کے جا دشمن اور وہاں کے اُمراء کی شان و شوکت کے قہقہے سُننے تھے۔ یہی سببِ دامتد کے اسباب تھے جو سلطان قلی کو اس ملک میں کھینچ لائے اور اُدُلِ عمر ہی میں وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ محمود شاہ ثانی نے جو اس وقت تخت پر بیٹھنا تھا، نو دار و شہزادے کو ہونا ردیکہ کر اپنے خاص ملازمین کے زمرہ میں شامل کر لیا اور اولا د کی طرح شفقت کرنے لگا۔

بہنی سلطنت کا زوال | محمود شاہ ایک عظیم الطبع لیکن کمزور اور میث پسند بادشاہ تھا۔ اُمراء کی آپس کی چشمکاس کے باپکے وقت سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ اس عہد میں ایک دوسرے کے برخلاف دل کا غبار نکالنے کا خوب موقع ملا۔ محمود شاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی نظام الملک بھری امورِ سلطنت پر حاوی ہو گیا۔ اور یہ منصوبہ باندھا کہ یوسف عادل خاں کو زک دے کر ترکی اُمراء کا زور توڑ دے۔ چنانچہ سازشیں شروع ہو گئیں اور قہر شاہی میں کئی درجہ سختیوں ہونے کے علاوہ ایک دفعہ بادشاہ کی جان بھی بال بال بچی۔ جب بد نظمی دن بدن بڑھتی گئی تو طرف داروں نے ملائے دبا لئے۔ لیکن بادشاہ پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ میث کا متوالا دن رات رنگ رلیوں میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ تختِ فیروزہ کو جس کی مرقع کاری میں بہنی بادشاہوں نے کئی پشت تک خزانے خالی کیئے تھے تو روکا جام و صراحی بنوا ڈالے۔ فرشتے نے محمود شاہ کے دربار کی تصویر نہایت پر لطف کھینچی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ امورِ سلطنت سے بالکل غافل تھا اور حکومت کی باگ اُمراء کے ہاتھ میں تھی دربار میں دہلی اور لاہور کے گویئے اُدُل کٹھک اور ایران اور خراسان کے مطرب حاضر رہتے تھے۔ قہقہ خواں اور داستان گو زنگین حکایات سے محفل کو گرم رکھتے تھے۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی رعایا نے بھی یہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ کُن سال شیوخ نے ذخیرِ رز کے عشق میں خرتے رہن کر دیئے۔ اور سفید ریش کتب کے استاد بلط سے کوہل میں دبا کر شراب خانوں میں جا بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے تلنگانہ اور بیدر کی نواح کے کل ملک بادشاہ کے قبضے سے نکل گیا۔ اور آخر

وقت میں تو قاسم برید نے ویل السلطنت کی حیثیت سے ایسا ٹانگ کیا کہ حکمرانی تو درکنار بادشاہ بغیر اس کی اجازت کے پانی بھی نہیں پی سکتا تھا۔ قاسم برید کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے امیر برید نے بادشاہ کے اوپر اپنے اثر کو گھٹنے نہ دیا۔ اور کٹ پتلی کی طرح اپنے اشارہ پر چلایا۔

قطب شاہی حکومت | سلطان قلی کی رگوں میں ابھی تازہ خون تازہ تھا۔ علاوہ ازیں آبار و اجداد کی چھ پشت کی کی ابتداء بادشاہی نے شاہانہ خصال میراث میں دی تھیں۔ چنانچہ شجاعت اور ولوالہ العزمی، دیانت اور آقا پرستی کے ایسے جوہر دکھائے کہ ابتداء عمر ہی میں قطب الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا اور تنگنا کا وسیع علاقہ صوبہ داری کے لئے ملا۔ سلطان قلی نے اپنے آقا کے نمک کا ہمیشہ پاس کیا اور گو "بریدیوں" کے بادشاہ پر عاد ہونے کی وجہ سے اسماعیل عادل خاں، ملک احمد نظام الملک اور ملا، الدین عماد الملک نے محمود شاہ کی زندگی ہی میں خود مختاری کا اعلان کر کے سکھ اور خطبہ اپنے نام سے جاری کر دیا تھا لیکن سلطان قلی کی حیثیت نے یہ دیدہ دلیری گوارا نہ کی اور جب تک محمود شاہ زندہ رہا خطبہ میں اسی کا نام برقرار رکھا۔ گول کندہ کی جامع مسجد کے کتبہ میں جو سنہ ہجری کا کندہ ہے محمود شاہ کا نام بادشاہ و وقت کی حیثیت سے نہایت احترام سے درج ہے۔ اور سلطان قلی کا نام بطور بانی عمارت کے لکھا ہوا ہے۔

سنہ ہجری کے اواخر میں محمود شاہ کی وفات کے بعد سلطان قلی نے قطب شاہ کا لقب اختیار کیا اور گول کندہ کو اپنا پائے تخت بنا کر چھبیس برس تک بڑے کرد و فر سے بادشاہی کی۔ اس عرصہ میں اس نے ساٹھ سے زیادہ قلعے اپنی بہادری اور قوت بازو سے فتح کیے اور نل گندھ، کھامیٹ اور قرب و جوار کے راجاؤں اور زمینداروں کو جو ہمینی بادشاہوں کے ضعف کی وجہ سے شوخ چشم اور قرب قرب خود مختار ہو گئے تھے اپنا مطیع اور باج گزار بنالیا۔ سلطان قلی ایک من چلا اور سورا سپاہی ہونے کے علاوہ نہایت ذی تدبیر سپہ سالار تھا۔ اور فن حرب سے خوب واقف تھا۔ جنگ کے موقع پر ایک تازہ دم دستہ ہمیشہ تیار رکھتا تھا۔ اور گھمان کے وقت ان سپاہیوں کو ساتھ لے کر غنیم پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ چنانچہ کئی لڑائیاں اس نے اسی طرح جیتیں۔ ایک اور چال جو اکثر چلتا تھا یہ تھی کہ توڑی سی سپاہ کو کین میں تیار رکھتا تھا۔ اور خود غنیم سے مقابل ہو کر پس پا ہو جاتا تھا جس وقت دشمن تعاقب کرتا تھا کین کا دستہ پکڑ کاٹ کر پشت پر جم جاتا تھا۔ اور مردہ فوج جو پس پا ہوتی تھی پلٹ کر سامنے

متقابل ہوتی تھی۔ اور دشمن چاروں طرف سے خطرے میں پھنس جاتا تھا۔ تلنگانہ کے زمینداروں کے علاوہ سلطان قلی کو اپنی قلمرو کی حدود کی حفاظت کے لیے بیجا پور احمد نگر اور بیدر کے نئے سلاطین سے بھی لڑنا پڑا اور بیجا نگر کے راجہ کشن رائے سے بھی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ الغرض نوے برس کی عمر تک یہ بدحاکم ملک گیری میں مصروف رہا۔ اور ایک ایسی سلطنت کی نیوڈال کیا جس کے استحکام نے ڈیڑھ صدی کے زلزل کے بعد بھی اورنگ زیب جیسے رفیع القدر اور مستقل مزاج بادشاہ کے دانت کھٹے کر دیئے۔

سلطان قلی کے عہد کے دو واقعات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جنگ میں توپوں کا استعمال جو شمالی ہندوستان میں بھی تقریباً اسی زمانہ میں بابر کی پانی پت کی لڑائی سے شروع ہوا۔ دوسرا شیعہ مذہب کی ترویج جس کو سلطان قلی کی اولاد نے بھی نہایت جوش و خروش سے جاری رکھا۔ اور آج تک حیدرآباد میں بیسیوں عاشور خانے آباد رہا۔ قطب شاہی خاندان کے مذہبی اعتقادات کی زندہ یادگار موجود ہیں۔

سلطان قلی کے جانشین | سلطان قلی کے بعد اس کے تین بیٹوں نے یکے بعد دیگرے ترمیم برس سلطنت کی۔ ان میں سے آخری بادشاہ یعنی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں مملکت کو بہت وسعت ہوئی۔ اور تلی کوٹ کی فتح کے بعد بیجا نگر کے راجاؤں کا زور بہت گھٹ گیا جس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جنوبی علاقہ کے زمیندار جو بیجا نگر کے حکام کی شہ سے روزمرہ بغاوت کرتے رہتے تھے۔ اب درست ہو گئے۔ علاوہ ازیں ملک میں فوج کا بیشتر حصہ ناگوارا ری سپاہیوں کا ہونے کی وجہ سے جو بد امنی کا اندیشہ رہتا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ سلطان ابراہیم قلی کا بیٹا تھا۔ اور باپ کی وفات کے بعد ۱۶۰۹ء میں تخت نشین ہوا۔ ہندوستان میں اس وقت اکبری "شہنشاہی" کا ڈکھانچ رہا تھا۔ اور ایران میں شاہ عباس صفوی مسند حکومت پر بیٹھنے کو تھا۔ سلیمان اعظم کو بھی بساط دنیا سے رخصت ہوئے ابھی عرصہ نہ گزرا

۱۷ سلطان قلی کی عمارتوں میں یہ علاقے شامل تھے۔ شرق پھلی پٹن راجمندی اور ادیبہ کی حد تک تمام ملک شمال منگور اور یگنڈل۔ غرب کو ہیر تک تمام علاقہ، جنوب کو یل کڈہ اور دریائے کرشنا تک تمام قلع اور محلات۔ مروجہ جغرافیہ کے موافق اس سلطنت میں یہ اضلاع شامل خیال کیے جاسکتے ہیں۔ درنخل، نگنڈہ، محبوب نگر، میدک، کریم نگر (بعض تعلقات)۔ علاوہ ازیں مدراس پریزیڈنسی کے گوداوری اور کرشنا کے اضلاع۔

تھا۔ اور یورپ میں اس کی فتوحات کی یاد تازہ تھی۔ اسلام کی تاریخ میں یہ زریں زمانہ علم سیاسیات کی اصطلاح "شہنشاہیت" کے لحاظ سے بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔

بیجا پور سے مصاحت | دکن کی اسلامی حکومتوں کے درمیان آپس میں ہمیشہ نزاع رہتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ابراہیم عادل شاہ دہلی بیجا پور سے اپنی بہن ملکہ زماں کی شادی کر دی۔ جس سے آئندہ کے لیے ان دونوں خاندانوں کے درمیان مصاحت ہو گئی۔ بادشاہ کو ملک میں امن ہونے کی وجہ سے رفاہ عام کے کام کرنے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ قانون میں بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ اور مال گزاری میں معقول قات کی گئی۔ تاریخ قطب شاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ تقریباً دو لاکھ ہون (چودہ لاکھ روپیہ) جو گزشتہ سلاطین کے وقت میں "محصول اجناس" کے عنوان سے جمع ہوتے تھے اس عہد میں بالکل معاف کر دیئے گئے۔ قلعہ کے مختلف حصوں میں مساجد بسے، محتاج خانے اور شفا خانے قائم کیے گئے۔ اور مسافروں اور راہ گیروں کے آرام کے لیے سرائے اور بادلیاں بنائی گئیں اور لنگر خانے جاری کیے گئے۔ بادشاہ کے خاص حشر انجی میر ابو طالب کا بیان ہے کہ خیرات کی مد میں سالانہ ساٹھ ہزار ہون (چار لاکھ روپیہ) کا خرچ تھا۔ جس میں سے بارہ ہزار ہون (چوراسی ہزار روپیہ) ماہِ محرم ہی میں عسکری امداد میں صرف ہو جاتے تھے۔

حیدر آباد کی بنیاد | محمد قلی کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ شہر حیدر آباد کی بنیاد ہے۔ چوں کہ فرشتہ اس وقت زندہ تھا اس لیے شہر کی ابتدائی حالت کے متعلق اس کی رائے قابل اعتماد ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "گو گنڈہ کی آب و ہوا متعفن اور خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے بادشاہ نے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک نہایت شاندار شہر بسایا جس کا نام ابتدا میں ایک مجبورہ کے نام پر بھاگ نگر رکھا گیا۔ مگر آخر میں وہ حیدر آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر کا دور درس میل کے قریب

۱۷ سیوان اعظم نے شہر تک سلطنت کی۔ اور اپنی مملکت کی حدود کو بوداپست (دکنار دریائے ڈینیوب) سے لے کر اسوان دکنار دریائے نیل تک اور دریائے فرات سے لے کر جبل الطارق تک پھیلا دیا۔

۱۸ ملک مغرب نے اسی زمانہ میں دکن کے اُس علاقہ میں جو مرہٹواڑی (دھاراشٹرا) کے نام سے مشہور ہے قوانین مال گزاری میں بہت تغیر و تبدل کیا۔ تعجب نہیں کہ محصول اجناس کی تخفیف بھی ملک مغرب کے نئے قوانین کا نتیجہ ہو۔ کیوں کہ اس کے قائم کیے ہوئے ضوابط کا عمل بہت جلد تمام دکن میں ہونے لگا۔

اور بازار اور راستے ہندوستان کے اور شہروں کے بر خلاف کشادہ اور صاف ہیں۔ آب ہوا لطیف اور پاک ہوا دہتی ہوئی ندیاں بعض بڑے بڑے بازاروں کے پاس سے گزرتی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں جو نظر کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ دکانیں پختہ ہیں، بادشاہی محلات ہندوستان کے اور شاہی محلوں سے بہت زیادہ شان دار اور خوشنمایان کیئے جاتے ہیں۔

فرشتہ آگڑ اور فتح پور سیکری کی رونق کو دیکھ چکا تھا۔ علاوہ ازیں بیجا پور کی شان و عظمت بھی اس کے پیش نظر تھی۔ اس لئے حیدر آباد کی نسبت اس کی تعریف و توصیف قطب شاہی بادشاہ کے نفس مذاق اور عمدہ تعمیر کی اچھی دلیل ہے۔ تاریخ قطب شاہی کے مصنف نے محلات اور باغات کی جو بادشاہ نے نئے شہر میں بنائے تھے ایک طویل فہرست لکھی ہے۔ آب و ہوا کی لطافت اور منظر کی خوش نمائی کے خیال سے یہ عمارات زیادہ تر روموسی کے کنائے تعمیر کی گئی تھیں جس کی متواتر طغیانوں نے ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ اور اب سوا ان بیانات کے جو کتب تاریخ اور سیاحوں کے سفر ناموں میں قلم بند ہیں کوئی دوسرا ذریعہ ان کی کیفیت معلوم کرنے کا باقی نہیں۔ تاریخ قطب شاہی میں سے یہاں دو محلوں کی کیفیت نقل کی جاتی ہے۔

خداداد محل | یہ سربہ فلک قصر موسیٰ ندی کے کنارے داد محل کے قریب تعمیر ہوا تھا۔ آسمان کے سات طبقوں کی طرح رفعت کے لحاظ سے اس کے بھی سات درجے رکھے گئے تھے۔ سب میں بلند درجے کا نام الہی محل تھا اس سے اتر کر محمدی محل تھا۔ محمدی محل کے نیچے حیدری محل تھا۔ جس کی دیواریں تمام زر نگار تھیں اور رنگ بزرگ کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ حیدری محل کے زیریں حصے میں درجہ بدرجہ حسنی حسینی اور جعفری محل تھے۔ قصر کے تیار ہونے کے بعد بادشاہ نے بڑی دھوم سے جشن کیا۔ اعیان سلطنت اور فضلا و شعراء کو انعام و

۱۵ ذخیرہ داد محل کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے مظلومین کی دادرسی کے لیے ایک زنجیر بارگاہ و خردی میں لٹکادی تھی جس کا ایک سرا بارگاہ سے باہر اڈیاں رہتا تھا اور دوسرا میرا بادشاہ کے تخت سے بندھا ہوا تھا۔ جب کوئی فریادی دادرسی کے لیے زنجیر لٹاتا تھا بادشاہ کو خبر ہو جاتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی جس کو بے کسوں کی امداد کا بڑا خیال تھا ایک مالی شان محل تیار کر لیا تھا اس کے دروازے بازار کے رخ رکھے تھے۔ حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو۔ بغیر زبانوں اور چوہوں کی فراغت کے خود بادشاہ کی خدمت میں عرض کرے۔ اس قصر کا نام داد محل رکھا گیا تھا۔

واکرام سے سرفراز فرمایا۔ میرک معین بنواری نے جو تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ عمارت کی تعریف میں ایک قصیدہ پڑھتا تھا۔ جس کے آخری شعر سے تاریخ نکلتی ہے۔ شعر

تاریخ مرتب شدنش کلک قضا

بر لوح لبت بنا، جاں بخش نوشت

فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے اس قصر کو دیکھا تھا اور اُسے بڑا تعجب ہوا تھا کہ جتھیں باغوں کے بڑے بڑے تناور درختوں کا بوجھ جو مختلف طبقوں میں لگائے گئے تھے کیوں کر سہارے ہوئے تھیں۔

بارگاہ خسروی | بارگاہ شاہی کا طول ہزار گز کے قریب تھا۔ چاروں طرف عالی شان ایوان اور محرابیں تعمیر کی گئی تھیں۔ دولت خانہ خاص کا دروازہ شرقی جانب تھا اور ہندو وضع کا بنا ہوا تھا۔ دو رفیع الشان ستونوں پر جن کی بلندی میں میں گز تھی بارہ گز لمبی پتھر کی کڑی ڈال کر چوڑھٹ فٹ کی گئی تھی اور دروازہ کے بالائی حصہ میں نہایت بلند عمارت بنائی گئی تھی۔ دولت خانہ کے دروازہ کے سامنے نقار خانہ تھا۔ حکم تھا ہر روز امراء اور عمائد فوج اپنے جلو کے ہاتھیوں اور سپاہ کے ہمراہ مجرے کی غرض سے بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اور خدم و خشم کو مناسب مقام پر چھوڑ کر تنہا آداب بجالائیں۔ بادشاہی شکوہ و وقار کے خیال سے فیل خانہ خاص کے بہت سے ہاتھی اور شاہی فوج کے ایک ہزار پیادے دو روئیہ صفیں باندھے بارگاہ کے صحن میں حاضر رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دو حبشی سرداروں کی ماتحتی میں کئی سو مسلح جوان پہرہ داروں کی حیثیت سے موجود رہتے تھے۔

بارگاہ کے صحن کے جنوبی جانب شاہی دفتر خانہ تھا۔ غرب میں جام دار خانہ اور شاہی کارخانوں کی عمارات تھیں شمالی جانب دولت سرا کا دوسرا دروازہ تھا۔ جس کے صحن میں عمدہ داران فوج و فیل خانہ اور اہل قلم کے لئے علیحدہ علیحدہ ایوان بنے ہوئے تھے۔ دولت سرا کے اندرونی حصہ میں کئی محل تھے۔ ان میں سے محل چندن محل اور گلن محل ترک عرب اور دکنی سلحہ داروں کے لئے مخصوص تھے۔ ایک اور بلند ایوان تھا جس میں پرانے معتبر طائراں اور مقرب سلحہ دار حاضر رہتے تھے۔ ایمان سلطنت اور فضلاء کا مجمع سخن محل میں رہتا تھا۔ اس محل کے شرقی جانب ایک نہایت وسیع ایوان تھا جس کا طول سو گز سے کم نہ ہوگا۔ یہ نعمت خانہ کے نام سے موسوم تھا۔ ہر روز صبح شام اہل مجلس میں سے دس ہزار آدمی بادشاہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

افسوس ہے کہ دست برد زمانہ نے ان محلات کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ لیکن محمد قلی کی بنائی ہوئی عمارات کی نشا و شوکت مضبوطی و استحکام اور موزونی و تناسب کا اندازہ کرنے کے لئے چارمینار اور چار کمان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں۔ یہ دونوں اپنی وضع کی عمارات میں نظیر نہیں رکھتیں۔ محمد قلی کا مقبرہ بھی جو گولکنڈہ میں واقع ہے نہایت خوشنما عمارت ہے۔ (ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۱۱)۔ اس کے طرز تعمیر میں ہندو صنعت کا اثر نمایاں ہے۔

ننون لطف کی سرپرستی | محمد قلی کو تعمیر کے شوق کے علاوہ دوسرے فنون کی بھی ترقی کا بہت خیال تھا۔ شعر و سخن کی طرف اس کی طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ چنانچہ خود بھی شعر کہتا تھا۔ ایک مبسوط دیوان جس میں اس کا اردو اور فارسی کلام درج ہے اب تک موجود ہے۔ میرے کرم دوست مولوی عبدالحق صاحب نے اسی مضمون میں ملحدہ محمد قلی کے کلام پر بحث کی ہے۔ شاعری کے علاوہ خوش نویسی کا بھی اس بادشاہ کو بڑا شوق تھا۔ نستعلیق اور نسخ کے استاد ایران اور عراق سے آکر جمع ہو گئے تھے۔ ان کے خطوط کے اصلی نمونے حیدرآباد کی عمارات کے کتبوں میں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ جامع مسجد کے بیڑنی دروازہ کا کتبہ خط نستعلیق میں بے مثل ہے اور اسی مسجد کی محراب کا کتبہ خط نسخ کا عمدہ نمونہ ہے۔ خوش نویسی کی تاریخ میں یہ میر عابد فرزدینی کا زمانہ تھا۔ نستعلیق خط اوج کمال پر تھا۔ حروف کی نشست قلم کا زور و ہمت کی صفائی دیکھنے کے قابل ہے۔

علم و فضل اور مذہبی تحریکات کے لحاظ سے بھی یہ زمانہ بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ اکبر کے عہد کے علماء کا حال اور خلوت خانہ کے مذہبی مناظروں کے قصے غلامی میں مشہور ہیں۔ ایران میں شاہ عباس کو مذہبِ شاعری کا بڑا پاس تھا۔ دربار میں میر باقر داماد شیخ علی نقی مکرم، بہاء الدین عالمی، ابن حیدر خوانساری، میرزا جلال اسیر، کوثری مولانا شانی کی صحبت رہتی تھی۔ شیعہ شریعت کی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ایک مرتبہ مولانا شانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں قصیدہ پڑھا۔ بادشاہ اس قدر غمخوار ہوا کہ مولانا کو سونے میں تلواریں دے دیں۔ ان کو انعام میں دے دی۔ دکن کے سلاطین ابتداء سے جعفری مذہب کے حامی رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایران سے علماء کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ محمد قلی کے عہد میں شیعہ عقائد کو خوب رواج ہوا۔ حیدرآباد کو اس

جامع مسجد حیدرآباد کے کتبہ رسالہ ایپ گریفیا انڈیا کا بابت ۱۱۳۰ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ قدیم خطاطی کے دلدادہ ان کو دیکھ کر ضرور غمخوار ہونگے۔

زمانہ کے علماء میں میر محمد مومن استرآبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ میر صاحب صفوی دربار میں کئی برس تک شاہزادہ حیدر میرزا کے اتالیق رہ چکے تھے۔ علم و فضل کے علاوہ بڑے زاہد اور متقی تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور وکیل السلطنت کے عہد پر مقرر کیا۔

لباس در حلیہ | متحف برطانیہ (برٹش میوزیم) میں سلطان محمد قلی کی ایک فلمی تصویر موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بادشاہ کے لباس اور خدو خال کے متعلق رائے پیش کرنے کی گنجائش ہے (تصویر نمبر ۲)۔

چارپشت کی دکن کی بود و باش اور موسم کے اختلاف نے تاتاری لباس کو بالکل اُتر دیا ہے۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی ہے۔ برے کی پستین اور بانا قی قبا کے عوض مل کا جامہ اور شبنم کا نینہ زیب بدن ہے۔ ہاتھوں میں حیراؤ کڑے ہیں۔ دائرھی صاف ہے۔ اور چہرے مہرے سے تیش کے آثار نمایاں ہیں۔

ایمان سلطنت میر حبلہ | شخصی حکومت میں بھی کامیابی کا انحصار بہت کچھ ایمان سلطنت کی قابلیت پر ہے۔

لیکن ایشیائی ممالک میں جہاں دربار میں خوشامدیوں کا جمع رہتا تھا اور روزمرہ سازشیں ہوتی رہتی تھیں لائق وزراء اور جان نثار عسائد کا انتخاب سہل کام نہ تھا۔ اکبر کے بعض مورخ اس کے نورتن کی تعریف میں چادہ اعتدال سے گزر گئے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل بھول گئے کہ بغیر اکبر کی دانشمندی اور ملکہ مردم شناسی کے نورتن جمع نہ ہوتے اور جو نمایاں کام انھوں نے کیے وہ ایک ہی بن نہ پڑتا۔ سلطان محمد قلی بھی بڑا مردم شناس بادشاہ تھا۔ اس کے عہد کے ایک وزیر میر محمد مومن استرآبادی کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ایک اور رکن سلطنت جس کا حال بیان کرنے کے قابل ہے۔ میرزا محمد امین جو تاریخ میں میر حبلہ کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کا رد و زیر نے اول مالیات کے ضوابط کو جو دکنی پنڈتوں کے داؤ گھات کی وجہ سے دام عنکبوت سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے صاف کیا اور گوسوریا راؤ معتمد مالہ نے بہت سی گجھٹیاں ڈالیں لیکن میر حبلہ کے مقابل میں اس کی کوئی ترکیب پیش نہ گئی۔ سلطنت کے اندر فی معاملات کی اصلاح کے بعد میر حبلہ نے سرحد کے علاقے کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ اور کئی مہموں میں سپہ سالار کی حیثیت سے خود بھی شریک ہوا۔ قلمرو کے

۱۵ میر حبلہ یا میر جگلی وکیل السلطنت کی مثل وزارت کا خطاب تھا۔

۱۶ سوریا راؤ غیر معمولی طور سے ذہین تھا اور علم سیاق میں ماہر ہونے کے علاوہ بے بدل منشی تھا۔

جنوبی حصہ میں کڑپہ اور کرنول تک جو ملک فتح ہو گیا تھا۔ وہ میر جلع کے حسن انتظام سے مستقل طور سے قبضہ میں آ گیا۔ سلطان محمد قلی کے عہد کے آخر میں میر جلع نے بستر کے راجہ کی سرزنش کے لئے لشکر کشی کی اور ملنگور اور مندلیہ میں مستحکم قلعے بنانے کے بعد مہینہ بھر تک راجہ کے ملک کو پامال کرتا ہوا آخر دار الخلافہ میں پہنچ گیا۔ اس مہم میں گو قطب شاہی فوجوں کو آخر میں پس پا ہونا پڑا۔ اور راستہ میں بڑے بڑے دریا عبور کرنے پڑے۔ لیکن میر جلع کے استقلال اور تدابیر کی بدولت لشکر کو زیادہ گزند نہ پہنچا۔

برہنہ تعلقات

شاہان سلسلہ صفویہ کو اوّل تو آل عبا ہونے کا فخر حاصل تھا۔ دوسرے ان کے اسلاف میں کئی پشت تک بڑے بڑے پایہ کے بزرگ گزرے تھے۔ چنانچہ ان میں شیخ صفی الدین اردبیلی کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔ قطب شاہی خاندان کے بادشاہ سلاطین صفویہ کا ہم عصر فرماں رواؤں کی حیثیت سے احترام کرنے کے علاوہ مذہبی نقطہ نظر سے بھی بڑا ادب کرتے تھے۔ سلطان قلی بانی خاندان قطب شاہیہ نے خطبہ میں شاہ اسماعیل صفوی کا نام اپنے نام سے قبل ارادت مندی کے اظہار کے لئے داخل کر دیا تھا۔ اس عقیدت کی وجہ سے رسل و رسائل کا سلسلہ دونوں خاندانوں میں ابتداء سے جاری تھا۔ سلطان محمد قلی کے عہد میں شاہ عباس صفوی نے اپنے خاندان کے ایک معزز شاہزادے اغزلو سلطان کو ایچی کی حیثیت سے قطب شاہی دربار میں بھیجا۔ مورخین نے ان تعلقات کی جو ایچی اپنے ساتھ لایا تھا مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ بیش قیمت اشیاء میں موتیوں کا ایک نہایت خوب صورت تاج تھا۔ جس کی چمک دمک کے سامنے آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ ایک مرتع خنجر تھا جس کا دستہ اور نیام قیمتی جواہرات سے فرّش تھا۔ چالیس عربی نثراد گھوڑے تھے جن پر زر فرشتی زین پوش تپے ہوئے تھے اور زین اور لگامیں تمام زین تھیں۔ سلطان محمد قلی نے بھی ایچی اور اس کے رفقاء کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ سب کو خلعت فاخرہ عنایت کیئے اور طرح طرح کے انعام و اکرام سے مہمانوں کے دل کو موہ لیا۔ کہتے ہیں کہ شاہ عباس نے ایچی کی زبانی محمد قلی کی مٹی کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ صفوی خاندان کے کسی شہزادے کے ساتھ اس لڑکی کا عقد ہو کر دونوں سلطنتوں میں دوستی اور یگانگت زیادہ استوار ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت محمد قلی کو شاہ عباس کی تائید کا ضرور خیال تھا۔ اکبر کے جد اعلیٰ تیمور کی پورشوں سے قطب شاہیوں کے اسلاف آذربائیجان میں کئی مرتبہ جلا وطنی کی تکالیف بھگت چکے تھے اس زمانہ میں بھی مغلیہ سلطنت کا دکن کے احقاق کا

منصوبہ محمد قلی کے لئے دل خوش کن نہ تھا۔ ہزارا اور احمد نگر فتح ہو چکے تھے۔ اور ست پوڑہ کی چوٹیوں پر شاہی فوجیں منڈلا رہی تھیں جن کی عقاب آسا نکا ہیں اس تاک میں تھیں کہ لشکار کو غافل پائیں تو کندے جوڑ کر ٹوٹ پڑیں۔

شاہ عباس کے ایک خط سے جو سلطان محمد قلی کے بھتیجے محمد قطب شاہ کے نام ہے، یہ بات صاف ترشح ہے۔ کہ محمد قلی اپنی سیاسی مشکلات کی اطلاع صفوی بادشاہ کو دیتا رہتا تھا۔ چنانچہ خط میں لکھا ہے کہ:-

”سلطان محمد قلی نے جو واقعات محمد قبر علی کی زبانی کہلا کر بھیجے تھے ہم کو معلوم ہوئے۔ کران اور رنج (کچھ) کا علاقہ فتح ہو گیا ہے۔ اب خشکی کے راستے سے آمد و رفت میں سہولت رہیگی اور رسل اور رسال کے پہنچنے میں زیادہ تاخیر نہ ہوگی“

وفات | اکتیس برس تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد سلطان محمد قلی نے سن ۱۶۰۲ء ہجری (مطابق ۱۶۰۱ء) میں وفات پائی اور اپنے واقعات زندگی سے متعقدین کے لئے زندہ دلی اور فیاضی انصاف اور رعایا پر درستی، علم دوستی اور مردم شناسی کی عمدہ مثال چھوڑ گیا۔

غلام نیردانی

{ حیدرآباد
، ستمبر ۱۹۲۱ء

لے موزین کا بیان ہے۔ اس بادشاہ نے خود کبھی قتل کا حکم نہ دیا۔ ایسے مقدمات ہمیشہ دارالقضاء کے سپرد کر دیتا تھا۔ ملد رجمی کا بھی اسے بہت خیال رہا۔ چنانچہ اپنے بھائیوں پر کسی قسم کا ظلم تشدد روا نہ رکھا۔ اور ماضی جلیلہ عطا کیے۔ ہندو عمدہ داروں پر اعتبار کرتا تھا۔ چنانچہ بہت سی سرحدی مہمات ان کے سپرد کیں۔

جزودوم۔ ادب

کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ

از

جناب لوی عبدالحق صاحب بی لے آنریری سکریٹری مہن تہی ارد

اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنی گنگا جمن کے دو آبے میں جنم لیا۔ لیکن وہ بات چیت کام کاج، سودا سلف تک محدود رہی۔ اہل علم نے اسے کبھی سُنھ نہ لگایا اور اس لیے اُس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کھکھیر نہ اُٹھائی۔ سب سے اول ادبی صورت اُس نے دکن میں حاصل کی اور دکنی کہلائی۔ اور گردہ عوام سے نکل کر مجلس خواص میں آئی۔ شعراء دکن جن کی تخیل کی جولا نگاہ فارسی زبان تھی، اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہو دکن کو اس کا فخر حاصل رہیگا اور اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہوگی۔

اس امر کو ہمارے ہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ے
خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا
تائم کہتے ہیں ے

قائم میں منزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات پھر سی بزبانِ دکنی تھی
اس میں دکنی زبان کی اس قدر نقیص مقصود نہیں جس قدر اپنی تعلی منظور ہو۔

ایک جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سر سبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ہر دھوم میرے شعر کی سائے دکھن کے بیچ
ایک زمانہ تک یہ خیال رہا کہ ولی اُردو کا پہلا شاعر ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مگر تعجب ہے کہ باوجود غلطی تسلیم کرنے کے اب بھی بعض تذکرہ نویس ولی کو اُردو شاعری کا آدم کہتے ہیں۔ معلوم نہیں آدم سے اُن کا کیا مطلب ہے۔ اگر آدم سے مطلب وہ پہلا انسان ہے جو تمام بنی نوع انسان کا مورث اعلیٰ ہے تو یہ خیال صریحاً غلط ہے کیوں کہ ولی سے بھی پہلے دکن میں اُردو کے شاعر ہوئے ہیں۔ اور اگر آدم سے وہ پہلا انسان مراد لیا جائے جس کا علم ہمیں پہنچا ہے (گو ممکن ہے کہ اس سے قبل بھی انسان ہوئے ہوں مگر ہمیں اُن کا علم نہیں) تو بھی یہ خیال صحیح نہیں، کیوں کہ ولی سے پہلے جو شاعر ہوئے ہیں ہمیں اُن کا علم ہے اور اُن کا کلام بھی موجود ہے۔ غرض اس خیال کی نوبت عقیدہ تک پہنچ گئی ہے کہ جاننے اور سمجھنے کے بعد بھی قلم اور زبان سے نکل جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا خیال قائم ہوا۔ جواب تک صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگرچہ ولی اُردو کا پہلا شاعر نہیں ہے تاہم وہ پہلا شخص ہے جس نے غزل کو فارسی رنگ میں لکھا ہے اور جس نے اپنا دیوان فارسی دیوانوں کے طرز پر لکھا۔ دار مرتب کیا ہے۔ تحقیق نے جو غلطی کی گمات میں لگی رہتی ہے، پھر اس خیال کو نہ چلنے دیا۔ معلوم ہوا کہ ولی سے پہلے بھی شعراء دکن نے اسی رنگ میں غزلیں لکھی ہیں اور مردوبہ طرز پر ردیف دار اپنے دیوان مرتب کیے ہیں۔ اس کا بین ثبوت سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلمات ہے۔ جسے آج ہم ناظرین اُردو سے روشناس کرنا چاہتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ دسویں صدی ہجری کا شاعر اور اکبر کا ہم عصر ہے۔ جہاں تک تحقیق نے رسائی کی ہے یہ کلام اُردو میں سب سے قدیم ہے۔ بعض مذہبی ثنویاں اس سے پہلے کی بھی پائی جاتی ہیں، لیکن تعزیر کے کوپے میں کسی دوسرے مسافر کا پتہ اب تک نہیں لگا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل نیا لہجہ لام اُردو کا نہیں ہے۔ اس حد تک پہنچنے کے لئے ضرور ہے کہ اس سے پہلے بہت سے عاشق مزاجوں اور موزوں طبع گوں نے مصرع شعری کو چہ گردی کی ہو۔ اور اپنی مشاتی اور طبع آزمائی سے غزل، ثنوی، قصیدے اور دیگر اصنافِ فن کو اس درجہ تک پہنچایا ہو جو ہم محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں دیکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن قابلِ قدر بزرگوں ر اُردو کے سچے محسنوں میں سے کسی کا کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ آئندہ جستجو اُنھیں ڈھونڈ لگائے

اور ہمارے علم و تحقیق میں اضافہ کرے۔

وہ وقت بھی کیسا عجیب اور پراسرار ہو گا جب کہ زبان پہلی بار تقریر سے نکل کر تحریر میں سما تی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ کوئی لڑکپن سے نکل کر بوعث کی سرحد میں اول قدم رکھتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آیا۔ خود اسے بھی نہیں معلوم ہوتا جس پر یہ گزرتی ہے۔ وہ عجیب آن ہے جو نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ بیان میں سما سکتی ہے۔ بعینہ ہی حال زبان کا ہے وہ آوازیں جو پہلی بار حروف میں منتقل ہوئیں ہمیشہ سے نظر سے پوشیدہ رنگی لیکن زبان کا مؤرخ اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ اگر نقش اول نہیں تو نقش ثانی تو کیس ضرور مل رہیگا۔ ایک زمانہ وہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دلکش انسانی آوازیں سینوں میں محفوظ رہتی ہیں اور ارثاً ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچتی ہیں۔ لیکن اردو کو وہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ گیتوں کی زبان اردو نہیں۔ اس لئے ابتدائی اردو سینوں میں نہیں سفینوں میں تلاش کرنی پڑے گی۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری کی زبان کا پتہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے لگتا ہے۔

یہ کلیات ایک نہایت قابل قدر اور نادر نسخہ ہے بڑی قلیع اور اعلیٰ درجہ کے قدیم کاغذ پر بخط نسخ بہت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ کتاب بہت ضخیم ہے تقریباً اٹھارہ سو صفحہ ہونگے۔ اسے محمد قلی قطب شاہ کے جانشین اور جتیبے محمد قطب شاہ نے بڑے اہتمام اور خلوص سے ترتیب دیا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانہ کا ہے اور سرورق پر خود محمد قطب شاہ کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر ہے (ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۳)۔ دونوں چچا جتیبے صاحب علم، صاحب ذوق، اور صاحب دیوان ہوئے ہیں۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ محمد قطب شاہ کی عادت تھی کہ کتاب پڑھنے کے بعد اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اپنی قلم سے لکھ دیتا تھا۔ چنانچہ اسی تصویر میں کلیات جامی پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار کا نوٹ دیا گیا ہے۔ دونوں تحریروں کا ایک خط اور ایک قلم ہے۔ اس تحریر کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ نوٹوں میں دبیج ہے اور اگرچہ اس سے اصل سے چھوٹا ہے تاہم عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔ اس تحریر کے اوپر ورق کے سرے پر جو عبارت لکھی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خاص کتب خانہ شاہی کا ہے۔ ان دو عبارتوں کے درمیان محمد قطب شاہ کی مہر ہے۔ مہر کی تحریر پڑھنا ذرا مشکل ہے اس لئے وہ نقل کی جاتی ہے۔

گشت زلفش بگین حیدر صفر مر

نہر سیلماں ز حق گشتہ میتسر مر

اور ان دونوں مصرعوں کے بیچ میں ”العبد سلطان محمد قطب شاہ“ لکھا ہے۔ صفحہ کے آخر میں بائیں طرف کتب خانہ میں داخلہ کی تاریخ ہے اور اسی کے نیچے ”تحویل بنی لعل نمودہ شد“ تحریر ہے۔ اور اس کے نیچے غنی قلم سے ”باقی الحال تحویل شد بن لعل نمودہ شد“ لکھا ہے۔ صفحہ کے اوپر کے حصے میں مہروں کی بائیں جانب کتب کی تعداد بھی درج ہے جس سے کتب خانہ کی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ کتب خانوں کی رونق صرف کتابت کے فن شریف پر منحصر تھی۔ کتابت کا سنہ خود قطب شاہ نے اپنی تحریر میں سنہ ہجری بتایا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب نے حیدر آباد فتح کیا تو شاہی کتب خانے سے بعض کتابیں بھی دوسرے مال غنیمت کے ساتھ دلی چلی گئیں۔ اور وہاں کے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئیں۔ اور جب دلی پر آئی اور وہاں کا کتب خانہ برباد اور فارت ہوا تو یہ کتاب پھرتے پھرتے کلکتہ پہنچی اور کلکتہ سے آخر پھر اپنے اصل مقام یعنی حیدر آباد پہنچ گئی۔ صفحہ کے شروع میں جو یہ عبارت لکھی ہے ”غزوات محمد قلی قطب الملک کہ مشتمل است بر اشعار فارسی و دکنی از اموال عبداللہ قطب الملک و حیدر آباد داخل کتب خانہ سرکار شد۔“ اس کی شان تحریر سے صاف ٹپکتا ہے کہ یہ فدویانِ شہنشاہِ دہلی کی تراویح قلم کا نتیجہ ہے۔ اور سرکار سے مراد سرکار شاہانِ مغلیہ ہے۔ حیدر آباد کی سرکار میں کوئی شخص محمد قلی قطب الملک اور عبداللہ قطب الملک کے نام بغیر آداب و القاب کے اس طرح بے تکلفی سے نہیں لکھ سکتا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ باوجود ان حوادث و انقلابات کے یہ کتاب صحیح سالم بچ گئی اور پھر وہیں آگئی جہاں سے لکھی تھی۔

کتاب کے بے بہا، نادار و مستند ہونے میں مطلق کلام نہیں ہو سکتا۔ صحت کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کتابت میں صحت کا امکان ہو سکتا ہے اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ خط بے نظیر ہے مگر نسخ ہے۔ کتابت بے شک لکھنے میں اپنا کمال دکھایا ہے لیکن یہ بزرگ عربی خط لکھتے لکھتے یہ بھول گئے کہ یہ ہندی کتاب ہے اور ہندی میں بعض حروف ایسے ہیں جو عربی میں نہیں اور جن کے ظاہر کرنے کے لئے خاص ملائیں ہیں۔ چنانچہ وہ بعض اوقات ڈاؤر، ڈاؤر، آج اور آج، آگ اور گ اور پ اور پ میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ ہندی کتاب کو نسخ میں پڑنا دیا ہے بھی مشکل ہے اور جب سم اخط کی دشواری بھی ہو تو مشکل اور بڑھ جاتی ہے۔ پھر جگہ جگہ دو لفظوں کو ملا کر اس طرح لکھ دیتا ہے کہ بغیر غور و فکر کے اس قسم کے لفظ صحیح نہیں پڑے جاتے۔ اول تو زبان قدیم اور اس پر خط اور طرز

وقت اس لئے جب تک پہلے سے کوئی زبان سے واقف نہ ہو، اس کا صحیح پڑھنا آسان کام نہیں۔

ہندوستان ہمیشہ سے پانچا مال السنہ رہا ہے، سنسکرت سے لے کر انگریزی تک کوئی نہ کوئی غیر زبان اس پر تسلط رہی۔ محمد قلی قطب شاہ کی حکومت گول کنڈہ میں تھی جہاں کی سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اور رعایا کی زبان تنگی۔ یہی حال عادل شاہیوں کا بیجا پور میں تھا کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی۔ یہ دونوں زبانیں براہوی ہیں اور انہیں آریائی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس ملک میں جب آردو نے دبی صورت اختیار کی تو اس کے خط و خال کیا ہونگے۔ تنگی اور کنڑی دونوں اجنبی اور غیر مانوس ان سے کسی قسم حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ لامحالہ فارسی کا رنگ اس پر چسپاں ہو گیا۔ اول تو فارسی آریائی، دوسرے صد ہا سال کی ایک جاتی دونوں ایسی گھل گھل گئیں جیسے شیر و شکر۔ تمام اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، غزل، اردو میں بھی بلا تکلف آگئے۔ الفاظ، تشبیہات، استعارات بنے بنائے تیار مل گئے۔ الفاظ کے ساتھ خیالات بھی داخل ہو گئے۔ اور قصیدے، مثنوی، رباعی اور غزل میں وہی شان آگئی جو فارسی میں پائی جاتی ہے۔ لیکن سب بڑا انقلاب جس نے آردو ہندی میں امتیاز پیدا کر دیا۔ وہ یہ تھا کہ عروض میں بھی فارسی ہی کی تقلید کی گئی ہے اور بغیر کسی تغیر و تبدل کے اسے آردو میں لے لیا۔ فارسی نے اسے عربی سے لیا تھا، آردو کو فارسی سے ملا۔ اگر آردو (ریختہ) کو ادبی نشوونما دکن میں حاصل ہوئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ بجائے فارسی عروض کے ہندی عروض (پنجل) ہوتا۔ کیوں کہ آردو، تنگ و جمن میں اس پاس ہر طائفہ ہندی تھی اور ملک کی عام زبان تھی۔ بہ خلاف اس کے دکن میں سولے فارسی کے کوئی اس کا اشتنا نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ فارسی اس پر چھا گئی۔ ورنہ یہ جو نمونہ اس امتیاز آردو ہندی میں پایا جاتا ہے وہ بھی نہ رہتا۔ اور غالباً یہ آردو کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔

میں نے ابھی لکھا ہے کہ اس خیانت شروع میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے جتیبے اور عائشہ سلطان محمد قطب شاہ نے ایک منظوم باب لکھا ہے اس باب میں اول اس نے یہ بتایا ہے کہ ان نظموں کو کس ترتیب میں دہرایا گیا ہے۔ یعنی اول مثنویاں پھر قصیدے، اس کے بعد ترجیع بند، ترجیع بند کے بعد فارسی مثنیٰ، اس کے بعد دکنی مثنیٰ۔ دکنی مثنیوں کے بعد فارسی غزلیں، فارسی غزلوں کے بعد دکنی غزلیں، اور سب آخر میں رباعیات۔ اس نے بعد وہ لکھا ہے

بجد ہو کے طبل اکہی نول ۛ پرے شعر پائیں کر خط سئل ۛ

آپس دل میں کر فکر سب ایک ات کے خطبہ کہ مستعد کلیات
 جو الحق سنے کوئی اگر یوزباں تو در حال کیسں مرجا بے گماں
 سوچ کج شاعری بیچ شہ دہر کمال بچن کہ کہ موتیاں من صد کمال
 کہے نین کہیں شعر میں صفا پس جو اچہ شعر کے فن میں اثیا سرش
 جو بھی کوئی اچھے شاعر اس دشتاؤ تو بن وصف پس کے ترے ساؤ
 اگر کم تو پچاس میں بیت چا کہے باج اپں وصف سینی سنگمار
 رہیا جائے نا شاعر ان منمنیں بن آکے صفت شعر کے فن بننیر
 جو خاصا ہی یوشا عراں ہر یک نریں بن کہے وصف بتیاں کنک
 مگر شاہ کہہ بیت پچاس ہزار دھرے وصف آپس سول کہیں بتیا
 دتا شعر کہہ بیت میں نیک بات کہی نین کہیں آپس وصف سات
 جو مقطع میں ہر یک اپں شعر کے لے بن سو حضرت علی نانوں پلے
 نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام بغیر از علی کا لے باج نام
 کہے وصف شہ کا اگر توجہ تہی تو ہر وصف میں شاہ کے کم و تا
 تو اب ختم خطبے کوں ظل الہ کے منگ علی ولی تھے پناہ

ظل اللہ، محمد قطب شاہ کا تخلص ہے۔ اس مقدمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ اور علاوہ فارسی اور دکنی کے تلنگی میں بھی ان کا کلام ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کہیں شاعرانہ تعلی نہیں کرتے اور مقطع میں ہمیشہ تبرکات حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام لاتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ خاص کر شعر و شاعری کے چرچے ایران

کہیں کہ کلام نہ اند نہیں نہ اپنا نہ اتنا نہ کمال نہ ہو یا رہے
 نہ قسم، طح نہ زہے کے نہ اتنا نہ نام نہ بتنا
 نہ ہنگ

مے لے کر ہندوستان تک یکساں تھے بلکہ ہندوستان کا قدم کچھ آگے ہی تھا۔ شعر و سخن ہماری معاشرت و اخلاق اور ہمارے علم و فضل کا بہت بڑا جز تھے اور ہر شخص جو شرافت کا دعویٰ رکھتا تھا، شعر و سخن کا بھی مدعی تھا۔ شمال میں اکبر کے دربار میں ابوالفضل جیسے اعلیٰ الشہرت اور فنی و عربی سے زبردست شاعر موجود تھے جن کا کلام ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ اکبر نے ہندی کی بھی سرپرستی کی اور پیر برہان سین اور خانخاناں کا ہند کا کلام اب تک موجود اور مرج ہے۔ شاہانِ دکن نے فارسی کے ساتھ ساتھ دکنی (قدیم اردو) کی بھی ویسی ہی قدر دانی کی جو قدیم اردو کے ابتدائی عروج کی پہلی بنیاد ہے۔ ہمارے بادشاہ صرف شعر و سخن کے قدر دان و سرپرست ہی نہیں تھے بلکہ خود بھی شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ اکبر اگرچہ اُمتی تھا مگر اس سے بھی بعض شعر منسوب کیے جاتے ہیں۔ یہی حال دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کا تھا۔ تاریخوں میں ان بادشاہوں کے نام سے بھی اشعار درج ہیں۔ لیکن ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نمبر سب سے اول تھا۔ اس کے کلام کا مجموعہ اس قدر ضخیم ہے کہ بادشاہ شاعر تو کیا پیشہ ور شاعر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جن کے ذوق کی بنیاد ایرانی شاعری اور بعد کے اردو کلام پر ہے، انہیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چستی نظر نہیں آئیگی۔ نہ انہیں الفاظ کی نشست اور ان کی باہمی ترکیبوں میں کوئی خوبی معلوم ہوگی۔ اور نہ طرزِ ادا میں (جس پر کلام کی خوبی کا بہت کچھ انحصار ہے) کچھ زیادہ لطف آئیگا۔ اس میں سراسر شاعر ہی کا قصور نہیں، پڑھنے والے کا بھی ہے۔ اس کے پڑھتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کر دینی چاہیئے کہ یہ اردو کا قدیم اور ابتدائی کلام ہے جس کے قبل کا کوئی کلام ہمارے پاس نہیں ہے اور اگر ایک آدھ چیز بھی تو وہ بھی کم و بیش ایسی ہی جو دوسرے اس کی زبان اس وقت کی ہے جب کہ اردو نے میدانِ ادب میں پہلا قدم رکھا ہے۔ اس لیے نہ صرف زبان کی صورتِ شکل میں ہی فرق ہے بلکہ طرزِ ادا میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ دکن میں ہندی نے جب ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں داخل گئی، لیکن بہت ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں۔ اُس وقت کے ادیب اور شاعر نے دو دریاؤں کو جو مختلف سمت میں بہہ رہے تھے ایک نہر بنو کر ملا دیا اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور ایرانی عشق کے

پہلو بہ پہلو ہندی پریم کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ صورت ایک ہی مگر جلوے دو ہیں بات ایک ہی مگر مرنے دو ہیں۔ بعد میں جو ادیب اور شاعر آئے جو مئے شیراز کے متوالے تھے، انہیں جو چیزیں اچھی اور غیر مانوس اور اپنے ذوق کے خلاف نظر آئیں وہ انہوں نے چُن چُن کر ہینیک دیں اور بجائے ہندی کے فارسی عنصر غالب آگے اس میں دلی اور اس کے ہم عصر بھی ایک حد تک قابل الزام ہیں۔ اس زمانہ میں مولوی حالی ایک ایسے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے اردو میں ہندی کی چاشنی دے کر کلام میں شیرینی پیدا کر دی مگر ہم عصر شعرا میں اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری کیوں کہ قدامتِ زبان اور طرزِ ادا نے اُس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور جب تک اُس زبان سے پوری قضا نہ ہو، اُس کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاعر کا یہ کچھ کم کمال نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منہ سے اُس وقت تک دودھ کی بو نہیں گئی تھی، اُن خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی صلاحیت فارسی میں صد ہا سال کے منجھ کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا پردہ عامل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے اوسط درجہ کے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ میں یہاں چند شعر نقل کرتا ہوں جن میں زبان کی دقت کم ہے، اُن کے دیکھ سے معلوم ہو گا کہ شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

کفر ریت کیا ہو راسلام ریت
ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

عشق کا رتبہ کس قدر بڑا دیا ہے اور اس بند مضمون کو کس سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔
یہ شعر اردو کے اچھے اور منتخب اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

چند اشعار اور لکھے جاتے ہیں۔

بنتی کو پیاکوں ہم بیج کی نہ آؤ
اُس باج منج گے نامنج باج کیوں گاو

(بنتی۔ منت سماجت۔ گنا۔ وقت کاٹنا، بسر کرنا۔ کی۔ کیوں)

مطلب یہ ہے کہ پیانے منت سماجت سے کہو کہ میری بیج پر کیوں نہیں آتا۔ مجھ سے تو ایک دم بغیر اُس کے بسر نہیں ہوتی

وہ میرے بغیر کیونکر بسر کرتا ہے۔

زہد ریاضتے بھودن بدنام ہو رہیا ہوں
پیالے پلا پریم کے کرنیک نام ساقی
(تھے = سے - بھو = بہت - پریم = پریم - محبت -)

تج بن رہیا نہ جادے ان نیر کج نہ جادے
برہا کتا ستا دے من سیتی من ملا د
(ان = فدا، نیر = پانی؛ برہا = فراق - کتا = کتنا)

رقیب کا ہے کو کرتا ہے ہم سوں کج بجاں
قبول ظلم و جفا ہے جو آے جاناں تھے
(تھے یعنی سے)

جیکو ی ہے عشق میں ثابت سدا ہی جیونا اس کا
سو اس کے نانوں سے میخانہ سب مہمور کر گئی
(نانوں = نام - جیکو ی = جو کوئی)

رقیباں منے جا بلانے نہجے، کہو اس بلانے کو کیا نانوں ہے
رہے پانوں دل سوں چلوں تیرے پتہ کہ اس پتہ چلنے کو دل پانوں ہے
(پتہ = رستہ، طریقہ - منے = تیں، پاس)

بنو جی قدر پیو کا وصل کی دیس سزا اس برہ کی راتاں میں پائی
(دیس = دن - برہ = ہجر)

تہا را میا ہونا منج چوک او پر کہ میں بالی ہوں ہو رنداں بچاری
اونیدی ہے منج نین تج یا دستی کہو تم نین میں ہے کاں کی مناری
(اونیدی = بے نیند کے - میا = محبت - کاں = کہاں)

یعنی، میری آنکھوں سے تو تیری یاد کی وجہ سے فینڈاڑ گئی، مگر تیری آنکھوں میں جو غماز بھرا ہوا ہے یہ کہاں کا ہے
 ان اشعار سے جو صاف اور سادہ ہیں، قلی قطب شاہ کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ قدیم زبان سے
 واقف ہیں انہیں اس کا خاص لطف آئیگا۔ میں نے حتی الامکان ایسے اشعار دیئے ہیں جو زبان کے لحاظ سے بھی
 صاف ہیں۔ ایسی ہی ایک غزل کے چند اشعار لکھتا ہوں۔ زبان اور مضمون کی سادگی اور اس کے ساتھ شوق،
 درد اور گھلاوٹ ملاحظہ ہو ۵

پیا بلج پیا لاپیا جائے نا پیا بلج کیٹل جیا جائے نا
 کسے تھے پیا بن صبور ی کرو کھیا جائے اما کیا جائے نا
 نہیں عشق جس وہ بڑا کو رہے کہ تھیں اُس سے مل بیٹیا جائے نا
 قُطَب شہ نہ دے مج دوانے کو بند دوانے کو کچ پند دیا جائے نا

اگر دو ایک شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا جائے جن کا درجہ درحقیقت نہایت بلند ہے، تو ہمارے ہاں کی عشقیہ
 شاعری میں کوئی بات نئی نہیں نظر آتی۔ چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعرا کے عشقیہ کلام کے سامنے
 رکھ دیا جائے تو سوائے زبان کے تغیر اور شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ وہی باتیں ہیں، وہی مضمون
 ہیں اور وہی طرز ادا اور وہی بحر ہیں۔ اس لحاظ سے سلطان قلی قطب شاہ کا کلام اردو کے کسی دوسرے
 شاعر سے کم نہیں ہے۔ عشق و مستی اور تصوف میں اس کا کلام کسی سے پیچھے نہیں۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ
 حافظ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرا دیا ہے۔ چند شعر بطور مثال کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۵
 یوں آج دستا ہو سکی اس وقت کا مصلحت نبجے جا بیٹھوں گا مینا نے میں اُس تھار ہے عشرت نبجے
 پیا لا پر م کا ہاتھ لیوں دو جاں کے سنگتے دور ہو ہی خوب بھجج جگ منے سوہے سدا دولت نبجے

پلا ساقیا منجھ کوں مستانہ ۵ کیا ہے بوت گرم چنگ ہو رنے
 بچلج عشق کو چے میں ہے سلطنت ۵ نہیں دیکھیا ہے کہ میں اس کو کے

۵ کت۔ ایک دم، ایک لمحہ ۵ کہیں۔ کبھی ۵ سینا۔ بنینا ۵ دکھائی دیتا ہے ۵ مکی ۵ مصلحت ۵ جو مقام شہ ۵
 ۵ جو کچھ ۵ جو کچھ

سدا پھولبن اور بڈ ہے بنے نہیں ہے حساری کہیں ہوئے
پیشوروں ہے تج جوت سوں سب جگت نہیں حسالی ہے نور تے کوئی شے

زہد ریاتے بھودن بدنام ہو رہیا ہوں پیالے پلا پر م کے کرنیک نام ساتی
مستی تھے اپ صراحی کرتی تھی کسرتی کرتی ہے جام کو اب ہر م سلام ساتی

اب مست اچھے دام ہیں مست اچھیکا ہنگام ہر ساتی صراحی نقل ہو رہیا ہے سو ہنگام ہر
عاشق اول تھے ہیں ہمیں سرستازل تمہیں نا آج کل تھے ہیں ہمیں زاہد کونیں یہ فام ہر
روزید کے عید آنے میں تاک شیر خماں کھاؤں صوفی چلے میخانے تیسرے ہات اب جام ہر
منگتا ہے دستاں کنے مدبج نہیں سکتا رہنے میخانے کے کوچے میں توتیتی بد نام ہر
ساتی پیالا منج پلا پیالا پیئے ہوئے تا اُس پیوکوں تو لیا کر ملا جس پیوتے منج آرام ہر

قطبا بنی کے ادھار تھے رحمت ہرنت کرتا ہر
تو منج علی کے پیار تھے تبتل نوا انعام ہر

گر جا ہے میگہ سر تھے تازہ ہوا ہے بتاں پھولاں کی باس پایا بٹبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لڑا جاواں قداں کُن چمنوں کی آرزو میں بیٹھے ہیں بے پرستاں
اونو نہال پھولاں ہے جام خوشے سوبادہ نرس اپس پلک سوں جھاڑو کرے شبتاں
کھ نور پر دے یوں منج خط عنبریں او جوں سورا پر ہے بادل ریحان سوں گلستاں
بیہوش میرے دل کوں منھے ادھر طلائی گھزار ہے عجب او دوسل شکرستاں

۱۰ شراب ۱۰ باہ کال ۱۰ اچھا ہونا یا رہنا ۱۰ نر ۱۰ روزید ۱۰ میں ۱۰ پاتا ہے ۱۰ مدد حمایت
۱۰ ہر دم ہر آن ۱۰ پرے از سر نو ۱۰ پاس ۱۰ اپنی ۱۰ لب

۲۴
 مچ عشق کے گداگوں اور نگ شاہی دیتا سب عاشقاں منج انگٹے ہیں طفل جو بے بس
 روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ
 بھرے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خستہ

ایک رباعی ہے ۔

مستی کے نگ میں ہے جانیانی بنے خواباں کے دیکھن میں ہر مسلمان بنے
 نثار کا حسم خانہ اسے ٹھاٹوں میرا ہر دم کا سوبہ نگیں سلیمانی بنے

ایک دوسری رباعی ہے ۔

کب لکٹ اچھے لب پہ زہد دل میں جام اس پاپ سوں بھریا سوز ہر منج کیا کام
 مد کے مدے لیا جو صفا میں ہیں تمام یک پختہ برابر نہیں ہے سو لک خام
 غرض اس قسم کے سینکڑوں شعر ہیں جن میں مستی اور می نوشی صاف بتی نظر آتی ہے۔ یہ سب فارسی شاعری کا طغیل
 ہے جس کا چہرہ شاعر نے اپنی زبان میں آٹا رہا ہے۔ یہ رنگ بہت خوب ہے مگر فارسی میں ضرورت سے زیادہ سخن ہو گیا ہے
 ذیل میں ایک غزل کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔ ان سے شاعر کے زورِ کلام اور قوتِ بیان کا بہت اچھا
 اندازہ ہو سکتا ہے

رک ایک ہر ہر ٹیک کہ سخن لاکہ چمن ہے لک جوت ہی ہر تھار دے ٹیک رتن ہی
 سمد ر ہے یک ہو زندیاں ہیں سو ہزارا باتاں سو کرداراں ہیں دے ٹیک رتن ہی
 کس عمار میں دستا نہیں سب ہر ہر پور دیکھن کو کھت کاں اسے ہر ٹیک فین ہی
 منج عشق گری اُل کا یک خشنک سو بوج اُس آگ کے شعلہ کا دھواں سات لگن ہی

لے آئے لے ہوند لے یک لے سب یہی کہ شراب کے مقابل میں جتنی عمدہ صفات ہیں لاؤ تو دیکھو گے کہ جس طرح ایک پختہ خیال
 کے مقابل میں سوا لاکہ نامِ خیال کچھ حقیقت نہیں رکھتے اسی طرح ایک شراب کے سامنے لاکھوں صفات ہیچ ہیں۔ لے کہ من۔ دن است لے سمد

اُس کے سو پرست پنت میں چل نہیں سکتا تجھ کو سود گار حسین اور حسن ہی

کیا یہ اشعار اپنے خیال اور رتبہ بیان میں حال کے کسی شاعر کے کلام سے کم ہیں؟

علاوہ اُن خوبیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جو ہمارے شعراء میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ سلطان

محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے جو اردو شعراء میں سوائے سودا اور نظیر کے کسی دوسرے کے

کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت، حمد و نعت، منقبت و مرثیہ تک

ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں، چلوں اور میوہ

پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے چلوں کا بیان کیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ بڑکی بڑولی، بنولی، انبازا، منگل، گنگل، سینڈلے کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایک مثنوی سبزی ترکاری کے

بیان میں ہے جس میں دھنیے، ادراک، لہسن تک کا ذکر ہے۔ اسی طرح ایک مثنوی شکاری پرندوں کے بیان میں

ہے۔ علاوہ ان کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں ایسی ہیں جو شاعر نے اپنے محلات (الہی محل، بلخ محمد شاہی،

داد محل، اعلیٰ محل، حنا محل) اُس وقت کے رسم و رواج اور تیوہاروں مثلاً شادی کے رسوم، اپنی سال گرہ

شب برات، میلاد نبی، عید خم غدیر، سوگدا، برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔ ایک مکالمہ صرا

و پیالہ پر اور دوسرا کالی گوری پر لکھا ہے۔ یہ بھی دونوں مثنویاں ہیں۔ اگرچہ یہ مثنویاں معمولی ہیں اور شاعری کے

لحان سے اعلیٰ رتبہ نہیں رکھتیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ گو اُس نے فارسی شاعری کا پورا اتباع

کیا ہے مگر اس کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے تنگ کوچہ سے باہر نکل کر صنعت و قدرت کی خوبیوں کی داد

دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ بحیثیت شاعر کے خاص امتیاز اور وقعت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف

پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ لکھا بلکہ اس نے عقدہ، تعلید سے باہر نکل کر جس میں اردو

شاعری ابتدا ہی سے مقید ہو گئی تھی، کسی قدر آزادہ ردی اور جہت کا مسلک اختیار کیا اور اپنے مشاہدہ کو کام

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴) ۱۔ سن = زبان؛ ۲۔ دستا = دکائی دیتا؛ ۳۔ کان = کہاں؛ ۴۔ چنل = چکاری؛ ۵۔ مگن = مگن

۶۔ پرت پنت = راجت ۷۔ سیں = سر ۸۔ ایک قسم کا سن ۹۔ تار کا پھل ۱۰۔ ایک چھوٹے سے بڑکی جڑی جسے میدرا بادیں

منج میوہ بھی کہتے ہیں۔ ۱۱۔ سیندھ کی درخت کا پھل ۱۲۔ سترہ کا وہ خط جو عربی آئمہ سے لے کر زلف تک سمیٹتی ہیں۔

میں لا کر ایسی چیزوں پر نظمیں لکھیں جس سے اُردو کے بعد کے شعرا بھی قاصر رہے۔

حمد و نعت، منقبت، مناجات، نذر دیگر مضامین پر بہت سی مثنویاں لکھی ہیں۔ اُن کے نمونے دینے سے مضمون بہت

طویل ہو جائیگا۔ قصائد بھی بہت لکھے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

باغ محمد شاہی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں سے یہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

محمدانوں تے بستا محمد کا لٹے بن سارا	سو طوباں سوں سہاتا ہے جنت سننے چین سارا
دسے فانوس کے درمیان تے جو جنت دیوے کا	سو تیوں ستاؤ دلاں میں تے میویاں کاٹنے سارا
بے دم عیسوی اُمّ حنین میں گل لگانے میں	ہر سے نہالاں کے چلے تے شاہیوں سارا
سُرک سے باغ کوں نکت کھلے منج باغ کُفجے	سو اُس پھنجے کے باساں تے لگیا ملک منگن سارا
چمن کے پھول کھلے دیکھ سکیاں کا کھ یاد آیا	سہاتا تھا محمد پہل من اُن میں سارا
دسے ناسک کلی چنپا ہواں و پات ہیں تے	ہنور تل دیکھ اس جا کا ہوا حیران من سارا
سو خوشے ڈاکھ لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جو	سے اُس داکھ مندو اسو جیسا سبز کن سارا
اناراں میں سے دانے سو جوں باقوت بلیاں	ہر ایک پہل اُس اناراں پر سے سکے من سارا
بجھوراں کے دسین چھونکے کہ جوں جاں کچھو	پاریاں لعل خستے جوں دسین ہو رین سارا
دسین ناریل کے پہل یوں مرد مر تاناں جوں	ہو ر اُس کے تلج کوں کتا ہے پالا کرد کن سارا
دسین جاموں کے پہل بن میں سلیم کے من سالم	نظر لا گے تیوں میویاں کوں اکھیا ہے حق سارا

صفت کرنے کوں سُن بی کھیا ہے دُن بان اپنے	دکن سب بندریاں کی تیں کھیا زنگس من سارا
چمن آواز سُن بل اپس میں آپ لاپس ہیں	سو تَس آواز سوں موراں کریں قصاں پین سارا

۱۔ اے۔ یہ ۲۔ بن۔ جسم ۳۔ کھانا۔ بگھانا ۴۔ زیب دیتا تھا ۵۔ مانند
۶۔ ناک ۷۔ انور ۸۔ گچھے ۹۔ جی

دھت کہ مست ہو دستک بجادیں پات ہمارے
سو ڈالیاں ڈلتے ہو متوال ہیں چول برہن را
مگر شبنم کا ہے ہر یا اُدھر جلاب کا پیالہ
یو بی خوب ہو را دبی خوب تجھوں مل پوئ را
انمگاں آپ انمگاں سوں پس آپ مل نہیں
تقنا کا تنن ناچیں ہوئے تن تن تن سارا
قصیدہ منقبت کی تشبیب کے چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

آج شبہ میں چلیا شرق نگر تھے شتاب
ذوال فلک کی اچھا اوشہ عالی جناب
باند خجر کرن کی زریں فرنگ ہاتھ لے
صبح کے وقت آٹیا پیکٹ دو پیالی شراب
چترک فلک فیل مست مستی سوں کھ لال کہ
گرم ہو چلنے لگیا دن لے کنگٹ بر حساب
ذتے ہو فر آتش سب چلیے شہ میں آگے
دیتے سر لپے شفق لا اسے زریں طناب
توس دفعہ ہات لے جوڑ کہ تیرا ستوا
سورکش جو کیا نس کہ اڑانے غراب
سوہی غلط یوں نہیں ہر قضایوں تو سن
شاہ متن سن چلیا غب نگر تھے دفعہ
کس کہ چلیا ہات توس اسے آسمان کی
جب آپس میں ان کی (چاند سوج کی) جھڑپ ہو گئی تو

اتنے میں دیتا ہے صلح خدا تین منیں
ہو میں بس دن کی شہ ناز و تم اتنے باب
میں کیا تم دو کوں شاہ یک سرج ہو ٹیکا
دھرتی میں دو نو باہ و نو کوں سر پر داب
دن کو سرج بس کو چند تم بھی کیا ہے داب
چاند کوں کنیا بھی سور کوں کنیا داب
چرخیات (فلکیات) پر متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ایک اور قصیدہ منقبت میں لکھا ہے اس کی تشبیب بھی اسی قسم
کی ہے اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی تشبیہات میں سوج چاند اور ستاروں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ شام کو

۵۳ پیک - پی کے

۵۴ کنگ - فنج

۵۵ اچا - بسند کیا (اچا نفل سے)

۵۶ چرک - چڑھ کے (عربی خط کی وجہ سے منع ہو گیا ہے)

۵۷ بس - رات

۵۸ جوڑ کہ - جوڑ کر

ہند پر قہر دیا جس میں سونے کی کشتی ڈوبتی ہو اور اُس کے ڈبنے سے لاکھوں کروڑوں جیلے نمودار ہوتے ہیں
اور یہی ستارے ہیں جو آسمان پر چمکتے ہیں۔ شعریہ ہے

بن کے سمند سیام میں تے کی روزق ڈیا ڈبنے میں ترنے لگے بڑے کے لکھ ہزار
دوسری جگہ سوبح کو یوسفِ فلک سے تشبیہ دی ہے کہ مغرب کے کنویں میں اُس کے ڈبے ہی زمانہ میں یعوب
کی آنکھوں کی طرح اندھیرا چھا گیا ہے

غرب کے چہ میں پریا یوسفِ انبر کا ہو ر
مگ بہیں یعقوب کے نین من اند کا ر
دوسری شعر میں کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ بجھ کر گلشن ہو گئی اور یہ اندھیرا جو دنیا میں
نظر آتا ہے وہ اُسی آگ کا دھواں ہے

آگ براہیم کا بجک ہوا پھول بن
رین سوتس آگ کا ہے دھنویکا دھند کا
دوسری جگہ کہتا ہے کہ چاند سکندر کی طرح رات کی ظلمات میں چلا جا رہا ہے اور تارے اُسے رستہ دکھانے
کے لئے شمع کا کام دے رہے ہیں

چند ہو سکندر چلارین کے ظلمات میں
شمع دیکھ مشعلاں روشن ہوئے اُپار
ایک جگہ کہتا ہے کہ سوبح نے چرخ کے خم خانے میں گھس کر اس قدر شراب پی لی کہ بدست ہو کر مغرب کے چشمہ
میں جا پڑا ہے

چرخ کے خم خانے میں سورپا جانو مد
مست ہو جا کر پریا غب کے چشے بنجار
ایک دوسرے شعر میں آسمان کو نگن سے چاند کو شمع سے اور تاروں کو قنگوں سے تشبیہ دے کر کہتا ہے کہ
تائے سوز عشق سے بے تاب ہو کر چاند کی شمع پر قربان ہو رہے ہیں

کمن ہر لگن شمع چاند تارے تنگ کے من
اڑتے ہیں اُس اُس پاس عشق تے بے اختیار

آگے چل کر آسمان کو حوض بتایا جس میں رات پانی کی طرح بھری ہو۔ چاند اُس کا فوارہ ہو اور تارے بوندیں ہیں
کمن کے سو حوض خانے میں یں میرا نیر جوں

چاند پھویرا من تارے بند اں نیر سار

غرض اسی طرح کی بیسیوں تشبیہیں دی ہیں اور جب تشبیہیں ختم ہو گئیں اور کوئی اور نہ ملی تو آسمان کو مدرسہ بنایا
چاند اُس میں مدرس بنے اور تارے طالب علم ہوئے جو مدرس سے بحث کر رہے تھے۔

کمن کے مدرسے سے چاند مدرس کئے

بحث کرن تارے اُنے طالب علم اں کے سا

ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر ہی جس نے ملاوہ غزلوں کے مختلف مضامین عشقیہ
اور غیر عشقیہ پر مثنویاں اور قصیدے لکھے۔ اسی طرح وہ پہلا شاعر ہی جس نے واقعہ کر بلا کے متعلق پر درد مرثیے اور
نوسے تحریر کیے۔ نمونہ کے طور پر ایک نوحہ لکھا جاتا ہے۔

دو جگہ اماں دکھتے سب جو کرتے زاری ملے ملے
تو لگن آٹھو جنت سا تو دریا سا تو دمست
کا لایک کسوت بکا دیکھو اماں دوک تے
لورج ہو رستم کرسی عرش قدیاں لک فلان سب
اسماں صبح جالا ہوا سوچ اگن والا ہوا
چنگی شے ہیں سب پراں رو رہا اے سہراں

تن و دل کی لکڑیاں جاکر کرتی ہیں خواری داسے داسے
اکیں تے ایک آپس میں آپ دکھ کرتے کاری ملے ملے
فلات بٹی کالا ہوا اس دکھ تے بھاری ملے ملے
بجلیاں بدل اڑو آتے ہیں ات ساری ملے ملے
چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ آپاری ملے ملے
چھوٹے ہیں سب اپنے گہراں دیکھو تو زاری ملے ملے

۱۰۰ آٹھوں

۱۰۰ ساتوں

۱۰۰ جل کر

۱۰۰ رداں

۱۰۰ بے عوض

۱۰۰ ہی

۱۰۰ دکھ

۱۰۰ چلے ہیں

کالے ہوئے دکھ تھے مغل سر پرشیں مانی سگل
 پہولائے سب دکھ سستی کھ موندے بل جھک سستی
 دیکھو تیں اسے مانائیں دانے چریں ناپکیاں
 دو جگ خراباں ہو رہے حواں کباباں ہو رہے
 دکھ آگ سوں جگ بن جلع آکاس تا دھرتی پہلے
 حضرت نبی کے گیسواں دو اماں کے پکائیں
 حضرت علی کے دو تپاش کا ندھے نبی کرئیں
 شہزادے کے سبکے ادناں ننھے پکائے اُس زماں
 جبرئیل آکر کے تہری برائے جو عفت کے
 دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دکھ
 یک پوت کو دیتے زہریک پوت پر کھینچے خنجر
 دکھ بات کو توجیب جلع لکھنے قلم بی نا چلے
 قلمبائے دل کے بچن ہر دم مدد منج منج تن

قطبہا کو ہے اللہ مدد بتا ہے اس دل میں احد
 تو منج مدد حیدر ولد سیریاں کو زاری لائے

اد پر جو نمونے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے پیش کیے گئے ہیں اُن سے فارسی شاعری کا اثر صاف
 ظاہر ہے۔ خیالات وہی ہیں استعارات اور تشبیہات پر بھی وہی رنگ غالب ہے اور بحریں بھی فارسی ہیں، لیکن
 باوجود ان تمام اثرات کے ایک بات خالص ہندی ہے جو اس کے کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔
 یعنی بکلاف فارسی شاعری کے عورت کی طرف سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ مدد کو بے وفائی کے

طعن دیتی ہے۔ سوکن (رقیب عورت) کی طرف سے بدگمانی اور رشک ظاہر کرتی ہے۔ برہ کی راتیں بے قراری میں کاٹی ہیں۔ غرض وہ عاشق ہے اور مرد معشوق۔ یہ ہندی شاعری کا رنگ ہے جو شاعر نے اپنی ادنیٰ شاعری میں قائم رکھا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے جہاں گیر کے دربار کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ”ایک موقع پر جہاں گیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی ایک غزل گارہا تھا اور بادشاہ اُس کو سن کر بہت مخطوط ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ یہ شعر گایا ہے

تو شبانہ می نائی بہر کہ بودی شب

کہ ہنوز چشم مست اثر خمار دارد

بادشاہ دفتہ بگڑ گیا اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنا لگے اور فوراً ملا نقشی مہر کن کو جن کا بادشاہ بہت محاط کرتا تھا، بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیمیا کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا، حضور خیر بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون باندھا ہے۔ جہلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوبہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشوونما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی انہوں نے اُسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیوں کہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ کا یاغیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔“

اس قسم کے ہزاروں شعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

پنیا کس سے لگائی رات ساری

تن آنخیاں میں پائی میں خجاری

یہ بالکل امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

گما کرین دوتی سے چھپاتے میں بوجی ہوں نشانیاں سببِین کے
 کمورات کن سات کیتی ہیں باتاں کہ چوٹا ہی تم میں تھے رنگِ خماری
 غرض اس قسم کے اشعار سے سارا دیوان بھرا پڑا ہی اور اس سے ہندی شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے
 اور بجائے ہمد و مونس کے سکی (سکھی) سہیلی اور ساجن اور بجائے رقیب کے دوتی، دُتن اور پریم، نیہ، پرت اور
 برہ کے الفاظ ہمارے قول کی تصدیق کرتے ہیں ۛ

تری نیہ کا منجھ کو بچھو لڑیا میرے سبھی تن میں بس اس کا چڑیا
 میں آئی تج پاس اتارا کرن تمیں کرن ہارا اتارا پیا
 جو دیکھی میں اُس دپ دنا سجن نین اُس سلونے تھے پھر بس چڑیا

نوازیں آپ میا سیتھیں توں محکوں کہ میں باندی ہوں تج سوں حب سارا

نکو ہو نکو ہو سہیلی کھیلی تج شہ کریں گے میا سوں نہالا

تمیں میرے مندر سو آج آؤ لا لا تم اوپر تھے داروں کی جو بن سبالا
 اگر سلطان محمد قلی قطب شاہ جاناگیر کے زمانے میں ہوتے اور وہ ان کا کلام سن پاتا تو کچھ تعجب نہ تھا کہ
 طیش میں آکر اُس کے ملک پر چڑھائی کر بیٹھتا۔
 بعد کے اُردو شعرا پر فارسی شاعری کا رنگ ایسا غالب آیا کہ یہ خصوصیت اُردو شاعری سے بالکل
 اُٹھ گئی اور رفتہ رفتہ بہت سے ہندی الفاظ بھی زبان سے خارج ہو گئے۔ اور اُستادی الفاظ کے متروک
 کرنے میں وہ گئی۔

علامہ ہندی شاعری کی اس خصوصیت کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندی زبان کی
 بعض اور خصوصیتیں می پائی جاتی ہیں اور الفاظ تو بکثرت ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حمد و نعت و منقبت میں بھی ہند

کے مذہبی الفاظ استعمال کرتا ہی۔ مثلاً
 کروں ابتدا احمد کرتار کا کہ منعم ہے کرتار سنار کا

کہوں حمد اُس جی سبجان کا دیانت داتا ر دیان کا

دہی رب نرنجن ہے لاریب فیہ

کہ توہیں اہے سب جگت کا گائیں

دنیا بے لگ سدا اندسوں نبی علی کے صیغے جگت اہے قطب شہ کہ داس ہے وہ علی دلی شاہ مرتضیٰ کا
 ہندی زبان میں ترکیب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ دو اسم ل کر ایک لفظ بن جاتے ہیں۔ اس کی
 کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً بعض وقت دونوں اسموں کے درمیانی حروف علت حذف ہو جاتے ہیں۔ جیسے ٹنگٹ
 پت جھڑ۔ کبھی پہلے اسم کا آخری یا دوسرے اسم کا پہلا حرف صحیح ساقط ہو جاتا ہے جیسے لوجوں۔ پھیل دھول تیل
 (سے) بعض اوقات دونوں اسم اپنی اصلی حالت میں رہتے ہیں اور کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی اور یہ ترکیب
 بغیر کسی حرف ربط یا اضافت کے استعمال ہوتی ہے۔ جیسے تیلی گھر کرن پھول، آن داتا۔ سلطان محمد علی قطب شاہ
 کے کلام میں آخری قسم کی ترکیب بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے صرف ہندی الفاظ ہی کی پابندی نہیں
 کی بلکہ عربی فارسی کا استعمال بھی اسی قاعدہ کے مطابق کیا ہے۔ مثلاً
 قطبا کوہی اللہ مدد بستاہی اس ل میں احد

یا

جنت حور ہے یا پری استری

لیکن کمال یہ کیا ہے کہ ہندی کے ساتھ فارسی عربی الفاظ بلا تعلق ملائیے ہیں۔ مثلاً

۱۔ جگت لوح تھے کفر آند کار کوں

۲۔ فارس اگن ہو ٹھنڈی کفر گون رہوا

۳۔ کفر ریت کیا ہو راسلام ریت

اسی طرح سموں باد اور وصال باد بھی استعمال کیے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ آزادی یہ برتی ہے کہ فارسی تائید کے مطابق ہندی فارسی الفاظ سے ملا کر فاعلی ترکیب قائم کر دی ہے۔ مثلاً

نبی مولود آکتیا ہے دو جگ تائیں نورانی فلک پر سب ملک کرتے ہیں تاریاں سوں پھل آفتانی
نکھال تس سوسد جون پوں بیز تھے پراں تھے جو جبریل کے تیز تھے

ایک جگہ ہندی ترکیب کی رو سے روز عید کو روزید لکھا ہے جس طرح آج کل بقرعید کو بقرید یا بکرید بولتے اور بعض اوقات لکھ بھی دیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کمال کیا ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اصناف کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے

پیائے ہیں دپ کے رنگ سول کہ چوٹا ہی اس کھ تھے نیر زلال

(نیر کے معنی پانی)

اس کے علاوہ فارسی داو عطف کا ہندی الفاظ اور جملوں میں بلا تکلف استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

باغ و پھل و جبل سے تو آتا بن صحبت یا ر خوش ندیے

تولپے بوجے میرے سب پن پاپ

تجہ حسن جھکار ہے سور جلیا زبردست توں ہی دسب تیرا زیر

تشبیہات و استعارات عموماً سب کے سب فارسی ہیں۔ البتہ دو ایک جگہ ندرت دکھائی ہے اور مشاہد سے کام لیا ہے اور یہ تشبیہیں خالص ہندی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ران کی صفائی کو کیلے کے تنے سے تشبیہ دی ہے۔

کیلے گاہے تھے نازک ہو ر صاف ران نہیں اس کی صافی میں کوئی صاف جان

یا کنول کے پتے پر ڈھلتی ہوئی بوند کی تشبیہ

کنول کے پان پر ڈھلتی سو جمل بند کہ یا جھلتی ہو نر نیاں پوں کے

ایک جگہ ہندی مذہبی روایت سے تلمیح کی ہے۔

نبی صدقے قطب سوں آئی ہے شاجوں رآم سوں منج اونخاری

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے عربی الفاظ کو اپنے کلام میں اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح اُس کے زمانے میں لوگ عام طور پر بولتے تھے۔ یعنی لکھنے میں صوت کی نقل کی ہے۔ تحریر درحقیقت تقریر کی نقل ہے۔ اور اصل عربی املا کی پردہ انہیں کی اور اُسی کو صحیح سمجھا ہے جو بولنے میں عام طور پر مروج تھا۔ سیدنا اللہ خاں نے دو صدی بعد اس نکتہ پر نظر ڈالی جس سے اُن کے ذوقِ زبان اور دقیق نظری کا پتہ لگتا ہے۔ وہ اپنی مشہور اور بڑی کتاب دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ ”ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا ہے، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوڑبی، ازرائے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اُس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اُردو ہے غلط ہے۔ گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو“ اس اُصول کے قائم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح بتاتے ہیں۔ مثلاً سیدنا اللہ کی رائے میں بُرقا صحیح اُردو کا لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے۔ یا وہ غدر کو بفتح د اُردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکون دہی۔ اس قسم کے الفاظ کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ اگرچہ یہ نکتہ اُصولِ زبان کو محاذ سے بہت خوب بیان کیا ہے لیکن اپنے کلام میں کہیں اس پر عمل نہیں کیا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس نکتہ کو دو صدی قبل سیدنا اللہ سے بہتر سمجھا اور اپنے کلام میں جا بجا استعمال کر کے دکھایا ہے۔ مثلاً

تقل	کو	کلف	لکھا ہے	تشبیہ	کو	تشبی	لکھا ہے
صریح	”	صری	”	شمع	”	شما (شمع)	”
منع	”	منا	”	وضع	”	وضا	”
ساعت	”	سأت	”	نفع	”	نفا	”
فہم	”	فام	”	انعام	”	انام	”

مصلحت کو مصلحت لکھائی دعویٰ کو دادے لکھائی

وداع کو دوا لکھائی وغیرہ وغیرہ

اسی طرح عرش، فرش، ظلم، وخت (وقت)، عشق، شوق، غُرب، بے تکلف استعمال کئے ہیں اور اصل الفاظ کے اعراب کی پرواہ نہیں کی ہے۔

الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی بہت کم لحاظ کیا ہے۔ مثلاً

جیت، بنیاد، جوت، یاد، شہرات، بھوک، پیاس، صورت، مصلحت، مصلحت، صحبت، تعریف، روح، حمد، دعا، نظر، مشعل کو مذکر باندھا ہے۔ ایک جگہ محبت کو بھی مذکر لکھ دیا ہے۔

بعض جگہ جہاں فاعل مؤنث جمع ہے تو وہاں فعل کے پہلے جز کو بھی جمع ہی لکھا ہے۔ اردو میں پہلے ہی استعمال تھا۔ اور اب بھی دلی اور نواح دلی میں بعض اوقات عورتیں سی طرح بول جاتی ہیں۔ مثلاً

قطب شہ کوں کھلاتیاں ہیں سہیلیاں رنگ بھرا میوا

سکیاں کی دعات ایسی ہی کہ چھند سولے پیاسوں مل کہ ہوتیاں ہیں کنارے

اسی طرح کیاں ہیں، دیتیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

قافیہ میں یاے بھول و معروف کا لحاظ نہیں کیا۔ مثلاً تیرا اور ہیرا یا دید اور بھید کا قافیہ

باندھ دیا ہے۔

تمام بحریں (سولے ایک آدم کے) فارسی ہیں۔ عروض کا قومی زبان اور خیالات سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ اردو نے ابتداء سے، یعنی جب سے اُسے ادبی حیثیت ملی ہے، غیر زبان کا عروض اختیار کیا۔ اگر بجائے فارسی (عربی، عروض) کے ہندی عروض ہوتا تو اردو ہندی نظم اور زبان میں وہ مغائرت جو اس وقت نظر آتی ہے نہ رہتی یا بہت کچھ کم ہو جاتی۔ یہ مسئلہ تفصیلی بحث کا محتاج ہے اور یہ موقع اس کا نہیں ہے۔ غرض سلطان محمد علی قطب شاہ کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور خصوصاً اردو زبان کی تحقیق کے لئے بے بہا ذخیرہ ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جواشی و فرہنگ کے ساتھ اسے شائع کریں تاکہ محققین و شائقین اردو زبان کو اس سے مدد ملے۔

تبصرہ

تذکرہ شاعر مولفہ میر حسن دہلوی

(از جناب مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر الصدور دولت آصفیہ حیدر آباد دکن)

”بدِ مینر“ نے میر حسن دہلوی کے نام کو آسمانِ شہرت پر مہرِ مینر بنا کر روشن کیا۔ روشنی طبع نے میر صاحب کو یہ مضمون پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ مثنوی مذکور کی نسبت کہتے ہیں ۵

رہیگا جہاں میں مرا اس سونام کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام
 ”مثنوی میر حسن کو جو قبولِ عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ جو پڑھ سکتے تھے انھوں نے پڑھی۔ جو پڑھ نہیں سکتے تھے انھوں نے پڑھوا کر سنی جاہلوں کا بھی یہ عالم رہا کہ جو دو چار شعر یاد تھے ان کو پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ چاندنی رات میں ماہِ کامل کی روشنی بہت سے ستاروں کو نگاہ سے ادھمل کر دیتی ہے۔ یہی حال ”بدِ مینر“ کی آب و تاب کے سامنے میر حسن کے باقی کلام کا ہوا۔ آبِ حیات میں آزاد نے لکھا ہے۔ دیوان اب نہیں ملتا۔ تذکرہ بھی طاقِ نیاں کی نذر ہو چکا تھا۔ بالآخر وقت آیا کہ کلامِ حسن کا حُسنِ سادہ رونمائے عالمِ اہلِ ادب کو مژدہ کہ ”انجمن ترقی اردو“ کلیات اور تذکرہ دونوں کی اشاعت پر آمادہ ہوئی۔ اول تذکرہ کی یاد ہوئی یہ تذکرہ میر حسن نے اُس زمانہ میں لکھا ہے جب کہ دلی کو خیر باد کہہ کر فیض آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ پناہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں ”شروعِ جوانی از گردشِ روزگار۔۔۔ بطرفِ لکھنؤ

وفیض آباد رسیدم۔“ تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اُس میں ”مثنوی رموز العارفین“ ہے۔ گلزار ارم نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۵ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا اور آج اُس کی تالیف کو ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا۔ رسم قدیم کے مطابق یہ تذکرہ فارسی زبان میں بہ رعایت حروف تہجی لکھا گیا ہے۔ ہر ردیف میں تین دو قایم کئے ہیں۔ مقتدیین۔ متوسطین۔ متاخرین۔ ”دور مقتدیین“ فرخ سیر سے پہلے۔ اس دو تین زبان ریختہ کا رواج زبان دکن سے ہوا۔ ”دور متوسطین“ آخر محمد فرخ سیر سے ابتدا محمد فتح شاہ تک ”متاخرین“ اس کے بعد سے زمانہ تالیف تذکرہ تک۔ اب سب مقتدیین ہیں۔ رہی نام اللہ کا۔

یہ تذکرہ شاہد ہے کہ مولف کو عبارت آرائی و رنگیں بیانی میں عمدہ دستگاہ حاصل تھی۔ وہ سادہ و پرکا طرز عبارت جو میر تقی میر کے تذکرہ کی ہے اس میں نہیں۔ میر کی یہ ادبی قوت خان آرزو کی تربیت کا ثمرہ تھی ایک مثال سن لو۔ میر تقی ایک موقع پر لکھتے ہیں۔ ”خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر گنجیدہ“ میر حسن اسی موقع پر کہتے ہیں ”خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر و تقریر گنجیدہ“ ارباب ذوق سلیم نے محسوس کیا ہو گا کہ لفظ کے اضافے نے زور کلام کم کر دیا۔

اس تذکرہ کے زمانہ تصنیف کی ایک خاص خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا ہے کہ دورِ سوم ختم اور دورِ چہارم شروع ہو رہا تھا۔ اس طرح مولف نے دونوں دور کے شعرا کے چشم دید حالات بلند کئے ہیں۔ میر۔ سودا۔ خواجہ میر درد اور حضرت میرزا مظہر کو دیکھا اسی کے ساتھ مصحفی۔ انشا اور جبرأت کو دورِ سوم اور دورِ چہارم کے طرز کلام کا ڈانڈا جہاں ملا ہے وہ اس تذکرہ کے انتخابی اشعار سے بخوبی واضح ہے۔ خوبی خاص یہ ہے کہ ایک پاکیزہ مذاق اُستاد کا قلم نکتہ سنجی کے ساتھ انصاف کی داد دے رہا ہے۔ اس لئے اہل کمال کے خط و خال اس آئینہ میں ٹھوہو ہو یدا ہیں۔

اگرچہ عبارت کا معتد بہ حصہ رنگ آمیزی کی نذر ہو جاتا ہے تاہم ہم معصرانہ قیمتی معلومات بھی قلم سے نکلتی جاتی ہیں جس سے شاعر کے انداز کلام طرز زندگی اور صورتِ شکل پر مبنی آفریں روشنی پڑتی جاتی ہے۔ مثلاً میر تقی کے حسبِ فیل ضروری حالات زیرِ نظر آ جاتے ہیں۔ اُن کا خان آرزو کا بھتیجا اور شاگرد ہونا۔ وطن اکبر آباد۔ اس تذکرہ کی تحریر کے وقت میر تقی کا سن ساٹھ برس کا تھا اور دلی میں مقیم تھے۔ جوان محمد شاہی تھے۔ میر تقی کا

میر حسن کہتے ہیں کہ میری شاعری آبائی ہے نہ آج کی۔ ہر چند کہ میر انیس نے اپنے لئے پانچویں پشت مداحی کا دعویٰ کیا ہی ع

پانچویں پشت ہی شیر کی مداحی میں
مگر میر حسن کی شہادت کی بنیاد پر چھٹی پشت تھی۔ میر نفیس نے کس نفاست سے اس سائل کو صاف کر دیا ہی ع
شمیر فصاحت پہ یہ ساتواں صقل
سات پشتیں ملاحظہ ہوں۔

- ۱۔ میر رامی
- ۲۔ خواجہ عزیز اللہ
- ۳۔ میر ضاحک
- ۴۔ میر حسن
- ۵۔ میر خلیق
- ۶۔ میر انیس
- ۷۔ میر نفیس

آدم بر سر مطلب۔ میر حسن کا نام غلام حسن تھا۔ اُن کے والد میر غلام حسین ضاحک نے دلی میں نشوونما پایا۔ آخر زمانہ میں فیض آباد میں جا کر سکونت اختیار کی۔ تحریرِ تذکرہ کے وقت زندہ تھے اور تیس برس سے ترک روزگار کر کے آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ عالم و فاضل تھے۔ ناظم و ناظر۔ ہزل دوست مزاح پسند۔ غزل چاہنے پچاس شعر سے کم نہ ہوتی تھی۔ فن موسیقی میں بھی دخل تھا۔ قد میانہ۔ رنگ بھورا۔ داڑھی اوسط۔ ریش بچہ منڈا ہوا۔ سب سے بڑا بھڑا عرب باندھے تھے۔ بڑا ساجبہ پہنتے تھے۔ فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ قصائد فارسی کی تعریف تذکرہ شعرائے ہند کے مولف نے کی ہے۔ متین کلام کا نمونہ یہ ہے

در پیش اگر روزِ اجل آہ نہوتا قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہوتا
اُس آن تھے آنسو جس آن کہ دل ڈوبا تب جان ہی ہم اٹھے جب دیدہ نم بیٹھے

۴۱ رباعی در منقبت

کشافِ حقایق و نجاتِ توحید اس را کب و ش احمدی شاہ شہید
خود معنی آیاتِ کلامِ الہی ست تفسیرِ حسینی ست بقرآن مجید

تذکرہ میر حسن میں یہ رباعی اُن کے نام سے درج ہے۔ حالانکہ وہ مولانا لطف اللہ شیرازی کی مشہور رباعی
ہی اور فارسی تذکروں میں اُن کے نام سے درج ہے۔

رباعی

افسوس نہ لاکہ غمگساراں رفتند سیسہیں بدناں و گلغذاراں رفتند
چوں بولے گل آمدند برباد سوار درناک چو قطرے باراں رفتند

میر حسن دلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم باپ کی عربی سے واقف نہ تھے۔ ابتدا سے شعر و سخن کا شوق تھا۔
اس سلسلے میں حضرت خواجہ میر درد کی خدمت میں رکبہ بنگلی حاصل کی۔ میر ضیا کے شاگرد تھے۔ مگر خود لکھتے ہیں کہ
مجھے اُن کی طرز کا نباہ نہ ہو سکا۔ اس لئے میر درد۔ سودا۔ اور میر کی طرز کی پیروی کی۔ تلذذ کی بابت آبجیات
میں لکھا ہے: ”میرزا رفیع کو بھی غزل دکھائی۔“ میر حسن کے بیان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تلذذ صرف
میر ضیا سے ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ یہ لکھتے ہیں کہ چوں کہ میں اُن کی طرز کا نباہ نہ سکا۔ اس لئے میر۔ درد اور سودا
کی طرز کی پیروی کی۔ یہاں بھی سودا کی تخصیص نہیں۔ آزاد نے جو خط میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام
نقل کیا ہے اُس میں بھی یہی لکھا ہے: ”اصلاحِ سخن از میر ضیا گرفتہ ام“ سودا کا نام نہیں۔ آغاز شباب میں دلی کی
تباہی سے پریشان ہو کر اپنے والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ وہاں سے بالآخر لکھنؤ جا کر بود و باش اختیار کر لی۔
اس سفر میں دلی سے چل کر اوّل چند مینے ڈیگ میں رہے وہاں سے حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ
مکن پور گئے۔ اسی منزل کی کیفیت نے مثنوی گلزار ارم کی باریں دکھائیں۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں نواب
سالار جنگ اور اُن کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گزریاں بھی تنگی
سے ہوتی رہی۔ خود لکھتے ہیں: ”چنانچہ تاحال بہر نوع گزراں مینہام“

حلیہ - داڑھی منڈی ہوئی۔ رنگ بھورا۔ قد اچھا بڑا (میر نفیس تک یہ قد وقامت قائم تھا) پُرانی وضع کی پگڑی سر پر (اب سرے سے پگڑی ہی نہ رہی۔ پُرانی وضع کون سمجھے گا) اپنے والد کی طرح بڑا ساجبہ پہنتے تھے۔ یہ حلیہ تذکرہ شعرائے ہند میں لکھا ہے۔ آبجیات میں اس کے خلاف یوں لکھا ہے "میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورازنگ۔ جملہ قوانین شرافت و آئین خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے اتنا تھا کہ داڑھی منڈاتے تھے۔ سر پر بانگی ٹوپی تن میں تنزیب کا انگرکھا۔ پھنسی ہوئی آستینیں۔ کمر سے دوپٹہ بندھا۔" اہل نظر فیصلہ کریں کہ کونسا بیان قابل قبول ہے۔ تذکرہ شعرائے ہند کی قدامت اور تحقیقات کے موقع کا زیادہ حاصل ہونا غالباً تذکرہ شعرائے ہند کو زیادہ مستند قرار دے۔

میر حسن کے اخلاق کی بابت تذکرہ شعرائے ہند میں لکھا ہے "وہ طریف اور خوش خلق آدمی تھا۔ مگر بیہودہ اور کلام معیوب کبھی زبان سے نہیں نکالتا تھا۔ سوار ازیں شیریں مزاج خوش خلق اور پسندہ تعلیم یافتہ تھا۔ کسی شخص نے اُس کو بُرا نہیں لکھا۔ اور نہ کچھ الزام لگایا ہے۔"

آخر ماہ ذی الحجہ میں حلیل ہوئے۔ عشرہ محرم ۱۱۷۷ھ میں انتقال کیا (یعنی منوئی "سحر البیان" کے ختم ہونے کے دو سال بعد) مرزا قاسم علی خاں کے باغچہ کی پشت پر مدفون ہوئے مصحفی نے تاریخ وفات کسی۔

چوں حسن اُس ببل خوش دلت
رُو۔ ازیں گلزار رنگ بوبخت

بسکہ شیریں بود لفظش مصحفی
شاعر شیریں زباں۔ تاریخ فیت

چار بیٹے تھے۔ اُن میں سے تین مجسم خلیق اور خلق شاعر ہوئے۔ شاید ہی اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملے کہ شاعری ایک خاندان میں آٹھ پشت تک مسلسل رہی ہو۔ یہ طرہ امتیاز میر حسن کے خاندان کی دتار پر کھلا۔ کبھی علوم سات آٹھ پشت تک شاذ و نادر چلے ہیں۔ چہ جائیکہ شاعری جو وہی ہے۔ پھر قدرت نے اس فرداوانی سے یہ نعمت اس خاندان کو بخشی کہ میر حسن کے تین صاحبزادے شاعر ہوئے۔ اور تین پوتے میر انیس۔ مولیٰ۔ اُنس۔ ایک میر انیس تنہا ایک ملک کے فرمے لے کافی ہیں۔

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ اب تک فقر نے قریب سات آٹھ ہزار کے شعر کے **میر حسن کا کلام** | ہیں۔ ایک ترکیب بند کہا ہے اور ایک منوئی رموز العارفین جو قبول خاطر و شہرت عام حاصل ہو چکا ہے۔

آبجیات میں آزاد کہتے ہیں۔ دیوان اب نہیں ملتا، اسی کے ساتھ قدرت اللہ خاں قاسم کا یہ قول دیوان کی نسبت نقل کیا ہے۔ ”انواع سخن سے لبریز ہے۔ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔ ”آج یہ نوبت ہو کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو کتاب میں درج کرتا۔“ مثنوی گلزارِ ارم کی نسبت لکھتے ہیں۔ میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی اب نہیں ملتی۔ تذکرہ آبجیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ”آزاد“ کو مثنوی رموز العارفین کی خبر نہ تھی۔ تذکرہ شعرائے ہند میں منشی کریم الدین نے میر حسن کی تصانیف کی نسبت عجب غلط بحث کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ”حسن مذکور کی تصنیفات یہ ہیں۔ ایک دیوان اقسام سخن کا جس میں تخمیناً آٹھ ہزار شعر ہیں۔ دوسرا تذکرہ ہندی مصنفوں کا ریختہ میں لکھا ہے۔ تیسری مثنوی بدرِ میرزا اس مثنوی کی برابر کسی سے آج تک اچھی مثنوی نہیں ہوئی۔ چوتھی سحر البیان۔ یہ سب بڑی کتاب میر حسن کی ہے۔ اس میں عورتوں کی پوشاک عجیبہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور طوائف کا بھی اُس میں ذکر ہے اور مسلمانوں کی رسالت شادی کا بھی حال اُس میں مندرج ہے۔“ ظاہر ہے کہ ”سحر البیان“ مثنوی بدرِ میرزا کا نام ہے۔ چنانچہ میر حسن نے مثنوی مذکور کے خاتمہ میں لکھا ہے ع

نئی مثنوی ہے یہ سحر البیان

منشی صاحب جس مثنوی کو سحر البیان کہتے ہیں وہ گلزارِ ارم ہے۔ لیکن وہ مثنوی بدرِ میرزا سے بڑی نہیں۔ ”تذکرہ“ ریختہ میں نہیں لکھا بلکہ فارسی میں لکھا ہے۔ رموز العارفین کا پتہ منشی کریم الدین کو بھی نہیں لگا۔ اور چوں کہ اُن کا تذکرہ ڈی ٹائپ کے تذکرہ سے ماخوذ ہے اس لئے ماننا چاہیے کہ ڈی ٹائپ بھی اُس سے سبجہ تھا۔ تذکرہ بھی دیکھا نہیں۔ سماعی خبر لکھ دی ورنہ اُس کی زبان کی بابت ایسی فاحش غلطی ہوتی۔ یہاں ایک وقت اور ہے۔ آزاد نے آبجیات میں جو خط خود میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام کا نقل کیا ہے اُس میں یہ عبارت ہے۔ ”تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ۔“ اس عبارت کے معنی خلافِ ظاہر یہ لینے ہونگے۔ ”دربیان شعرائے ریختہ نوشتہ“ ورنہ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ شعرائے ریختہ کے دو تذکرے میر حسن نے لکھے ہوں۔ ایک زبانِ ریختہ میں دوسرا فارسی میں۔ غالباً اسی خط کی عبارت سے منشی کریم الدین کو غرض ہوئی۔

خدا کا شکر ہے کہ جو نعمت مولف آبجیات کے لئے پردہ ظلمات میں رہی وہ محکوم لگئی۔ لکھنؤ سے کلیاتِ میر حسن کا نسخہ ہاتھ آیا۔ جو نسخہ لکھا ہوا ہے۔ مطلقاً اور مذہب ہے اور اُس اتہام سے لکھا گیا ہے جس اتہام سے فارسی شاعرِ آزاد کو لکھی جاتی تھی

[illegible]

ادبی نکتے] جس طرح میر صاحب نے ”نجات الشعر“ کو ضمناً جا بجا ادبی نکتے اور فائدے بیان کر کے زمیت دی، اسی طرح میر حسن نے اپنے تذکرہ کو آراستہ کیا ہے۔ ریختہ کی تعریف ”ریختہ اول از زبان دکن رواج یافتہ“ اس لحاظ سے یہ گراں بہا جس شاہجہانی اُردو بازار کی دکانوں کی ملکیت نہ تھی (میر حسن اور میر تقی میر دونوں نے اپنے اپنے تذکرہ میں اس زبان کا نام یا ہندی لکھا ہے یا ریختہ۔ اُردو جہاں تک میر خیال ہے، کیسے نہیں لکھا۔ منشی کریم الدین نے اُردو کے ساتھ ہندوستانی بھی لکھا ہے) طرز متعین و متاخرین کا فرق ”طرز متعین بطور ایہام۔ طرز متاخرین بزبان حال ادائیہ“ میر تقی نے خاکسار کے اس شعر میں ۵

فاکس آؤس کی تو آنکھوں سے گے مت لگیو۔ مچھوان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

یہ اصلاح دی تھی: ”برمتعہ اس فن پوشیدہ نیست کہ بجائے ”بہا کر کیا“ ”گرفتار کیا“ می بایست“ میر حسن کہتے ہیں۔ ”در عقل فقیر چنین گزند کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں اینجا چشم معشوق است بیماری صحت دارد۔“ دیکھو کیسی باریک بات سمجھا گئے۔ راقم کا ایک شعر نقل کیا، ۵

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں
کنے کو یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

کہتے ہیں کہ اس شعر میں ”عین“ (عاشقوں کا) قطع سے گرتا ہی اور یہ عین خطا ہے۔ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا
میر! تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں

معینِ بد اوئی کا ایک شعر ہے

خوش ہم غریانی سے اتنے ہیں برنگِ بوگل نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک سے ہم
میر حسن کہتے ہیں: ”خوش ہم غریانی ناموزوں ست چرا کہ ”میم“ با ”را“ چناں چسپیدہ است کہ ”عین“ چوں
چشمِ غزال از میاں رَم کردہ۔ وایں سخت عیب ست“ سجاد کا شعر ہے
تجھے غیر سے صحبت اب آہنی اسی دوستی ہم سے ہی دشمنی

میر حسن کہتے ہیں ”اسی دوستی“ زبانِ قدیم ست یعنی برائے ہمیں ”فی البدیہ۔ راجہ رام نرائن موزوں
تخلص۔ نواب سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ شیخ علی حزیں کے شاگرد و آشنا پرست“
سیاہ دوست۔ فارسی کا ذوق تھا۔ ریختہ کا صرف ایک شعر کہا جو مشہور ہو گیا۔ اس کا واقعہ خود میر حسن کے
الفاظ میں سنو ”شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ۔ مگر وقتیکہ خبر شنید شدن سراج الدولہ در شہر افتاد ہماں وقت فی البدیہ
ایں شعر منیخاند و از خبر داراں خبری پرسید می گریست

غزالاں۔ تم تو واقف ہو۔ کو مجنوں کو مرنے کی دوانہ مر گیا آخر کو۔ ویرانہ پہ کیا گزری؟
ہمیں شعر از ویادگار ماند۔ ذرا اس شعر کو مکر پر پڑھو اور اس کے درد کا اندازہ کرو۔ اور یہ بھی غور کرو کہ ایک
”آشنا پرست“ ماتحت کے دل کی واردات کا سچا نقشہ ہی کیا اس کے بعد مجھ کو یہ کہنے کی اجازت ملے گی کہ لیونج
کے سیاہ کا۔ بلیک ہول کے داغدار سراج الدولہ! تیرے دل میں تو محبت و ہمدردی کا چراغ روشن نظر
آتا ہی! اُن کے اُستاد میر تقیانی نے اپنے یہ شعر اُن کو سنائے تھے

ترتیبِ ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جا کر جو آج دن کو دیکھائیں کر قفص اک دل جلے ہو اُس میں حسرت کی داغ کتنے
سلام اللہ فاں تسلیم ایک فارسی گو شاعر نے ترجمہ کر کے یہی مضمون اپنے نام سے مشہور کر دیا ہے
دوش رفتم بر مزار کشتہ تسلیم خویش نمود از دور صد شمع و چراغ حسرتے

چوں شدم نزدیک دیدم از تفصہا بے یک دے میوخت با بے چند داغ حسرتے
میر حسن خفایں (اور غفلت بجاہت) تسلیم در فارسی ترجمہ کردہ بنام خود شہرت داد۔ ایں ندانست کہ در نظر صورت
شناسان معانی متبنی و فرزند پوشیدہ نمی ماند۔ مثل ہندی مشہورست۔ ”ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی
اُس کا ناؤں۔“ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تسلیم کے شعر زبان فارسی کی قوت و صفائی کی بدولت ضیاء کے
اشعار سے زیادہ تابدار ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ ضیاء کی زبان بوجہ قدامت ماند پڑ چکی ہے۔ مصرعِ اوّل
میں ”کشتہ تسلیم“ نے جان ڈال دی ہے۔

میر حسن صرف ادبِ اردو کے نقاد نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعر کے کلام کی نقادی پر بھی پوری
قوت تھی۔ اور ہر ایک کے طرز کا جدِ اجدا اندازہ حاصل تھا۔ چنانچہ اساتذہ اردو کے کلام کی طرز کو اساتذہ فارسی
کی طرز سے تشبیہ دیتے جاتے ہیں۔ میر ضیاء ”طرزِ مانا بہ طرزِ مولانا نسبتی“ میر تقی ”طرزِ مانا بہ طرزِ شفقائی“
خواجہ میر درد ”دیوانش اگرچہ مختصرست لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب“ میر درد کا ایک شعر ”لو۔فظ
کے بہت سے شعر یاد آجائیں گے ۵

ساقیا یاں لگ ہا ہی چل چلاؤ جب تک بھل پکے سا غپ چلے
قائم چاند پوری ”طرزِ بہ طرزِ طالبِ آملی می ماند“ زبان کی کمال دلی ہے۔ قائم مذکور کے حال میں
”متوطن چاند پور ندینہ۔ چوں از ابتداءے جوانی در شاہجاں آباد آمدہ بسر برد بنا برآں محاورہ او درست گشت“
معین بدآؤنی کا ایک مصرع ہے۔ ع

نہ آیا یار، دوپہری بھی اب ڈھلی افسوس
میر صاحب لکھتے ہیں۔ ”ایں محاورہ درست نیست۔ مردم شاہجاں آباد دوپہر ڈھلی میگویند۔ دوپہری
مگر مردم بیرونجات۔“ ایک شعر میں شاعر موصوف نے ”بتِ خانگی“ بانڈھا ہے۔ میر حسن کہتے ہیں۔ ”بتِ خانگی
نامانوس بت۔ فقیر دیہچ جانشیدہ“

سرمایہ مشترک | یہ زمانہ صنعت و حرفت کی ترقی کا ہے۔ گوناگوں مصنوعات سے نہ صرف بازار بلکہ گھروں
کے در و دیوار معمور ہیں۔ اسی سلسلے میں بہت سے مصنوعی مسائل کا انبار ہے جو ہماری زندگی پر مؤثر ہیں۔

انہیں مسائل میں سے ایک مسئلہ ملکی زبان کا ہے۔ ایک زبان صرف مسلمانوں کی ہے اُس کا نام اُردو ہے۔ دوسری ہندوؤں کی ہے اُس کو ہندی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے چاروں گوشوں کو دیکھا۔ شہر۔ دہات۔ پہاڑ اور جنگل دیکھے مگر زبان کی تقسیم کہیں عمل پزیر نہ بھی۔ تذکرہ میر تقی میر اور تذکرہ میر حسن کے مطالعہ سے صاف واضح ہے کہ ریختہ کھوار و کوہندی کو جو نام چاہو رکھو مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہل ادب کی محنت مشترکہ کا ثمرہ ہے۔ ابتدائے شاعری سے لے کر انتہا تک یہ اشتراک محنت عیاں ہے۔ نجات الشعراء جہاں متقدمین شعرائں خان آرزو اور قزلباش خان آمید ہیں وہاں رائے انند رام مخلص اور ٹیک چند بابر بھی ہیں۔ متوسطین میں بند راجن راقم ہیں۔ میر حسن کے تذکرہ میں بھی بہت سے ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ جن میں سے بعض جگت استاد تھے۔ مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص۔ اُن کی نسبت لکھا ہے ”شاعر زبردست فارسی بہت۔ شعر بسیار گفتمہ است۔ استاد ریختہ گویان کھنؤ چنپنچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیران و اکثر دیگران شاگردِ اویند۔ در آنجا مشہور و معروف است۔“ حسرت مذکور اساتذہ کھنؤ میں سے ہیں۔ جرات کے استاد۔ شاگردوں کی یہ کثرت تھی کہ پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایک اور معتبر شہادت۔ منشی کریم الدین نے تذکرہ شعرا ہندی میں (جو ڈی ٹائپ کے تذکرہ سے ماخوذ ہے) طبقہ دوم۔ اُن شعرا کے ذکر میں لکھا ہے جو مصلح اُردو اور مروج اس زبان کے تھے۔ اور انھوں نے الفاظِ کریمہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کر دیا۔ اس طبقہ میں سب سے اوّل راجہ جسونت سنگھ تخلص بہ پروانہ کا ذکر ہے۔ یہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے نائب راجہ بینی بہادر کے بیٹے اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ جرات کی وفات کی تاریخ کیا خوب کسی ہے۔

”کو محنت نصیب جرات ہے“

پروانہ کے دیوان کی بابت یہ رائے ظاہر کی ہے۔ دیوان اس شاعر کا دیکھنے میں آیا۔ بہت اچھا۔ پاکیزہ شہادہ اُس کے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اسپرنگر بہادر کے پاس وہ دیوان موجود تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں حسبِ ذیل ہندو شعرا کا ذکر لکھا ہے۔ رائے پریم ناتھ۔ ٹیک چند بہار۔ سنو کہ رائے بیوا۔ ریان ناتھ سنگھ۔ لالہ سرب سنگھ دیوانہ گھاسی رام خوشدل۔ بند راجن راقم۔ لالہ ہلاس رائے رنگین۔ لالہ خوشوقت رائے شاداب۔ رائے بھکاری داس عزیز۔ فارغ۔ بدھ سنگھ قلندر۔ لالہ کاشی ناتھ۔ انند رام مخلص۔ راجہ رام نراین موزوں۔ عجائب رام منشی۔

لالہ نول رائے وفا۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے مذکورہ بالا مصنوعی تفریق کو دیکھ کر چارہ کاری ہی کہ ملک اور اہل ملک کے حال پر افسوس کیا جائے۔

اس عہد کی معاشرت | عموماً شعر کی نسبت یہ خیال ہی کہ وہ ایک بیکار رفیقہ ہی جو خیالی دنیا کی سیر میں مصروف ہے۔ کلام کی شوخی و رندی سے قیاس کیا جاتا ہے کہ قائل اپنی حالت کا مرقع کھینچ رہا

ہے۔ واقعات اس خیال کا ساتھ نہیں دیتے طبقہ شعراء میں کثیر حصہ ایسے کاروباری آدمیوں کا تاجن کا معیارِ اخلاق بلند تھا۔ اور جو شعر گوئی کو زندہ دلی کا سامان اور آداب کی خدمت تصور کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اور کمالات انسانی میں قدرت و کمال پیدا کرتے تھے۔ ذیل کے شعراء کے اخلاق و مشاغل پر نظر ڈالئے۔ امید ہے کہ آپ بھی میرے ہمنوا ہونگے۔ میرا اثر۔ "خوش اوقات و نیک سیرت" ریشے ست موثر۔ و صاحبِ سخن ست موثر۔ عالم فاضل۔ "عاشقی"۔ در علم تاریخ و شمیر شناسی و لطیفہ گوئی دستے ہم رساندہ۔ "راستے پریم نامہ"۔ خطاط بے نظیر کمان ابد دل پذیر۔ غزل فارسی خوب ی گوید۔ آگاہ۔ "بوسیلہ قصہ خوانی بھری برد۔ دریں فن شاگرد میر محمد مرحوم ست کہ بقصہ خوانی مشہور بود" میرا علی علی۔ "خلیق و متواضع" میر شیر علی افسوس۔ "دار و نہ توپ خانہ" علیجا جولانے ست ظاہر و باطن آراستہ۔ بحلم و حیا پر راستہ۔ "بیدار"۔ "بزیورِ حلم و حیا آراستہ"۔ "شمت"۔ "پہا ہی پیشہ"۔ "فیہدہ و سنجیدہ"۔ متواضع و مؤدب۔ "زنگین"۔ "پہا ہی پیشہ"۔ خوش اوقات و نیک ذات۔ جوان محمد شاہی خط و خط و خوش می نویسد۔ مہربان خاں زندہ اس عہد کے امرا کا ایک نمونہ) نواب غالب جنگ بہادر دلی فرخ آباد کے وزیر۔ "مجلد زنگین" بزمِ ارم زمزمین داشت۔ ہر صادر و وارد کی فراخ حوصلگی سے خدمت کرتے تھے اہل سخن اور ہر فن کے اہل کمال سے ربط تھا۔ موسیقی اور ہندی شاعری میں جو کتبوں سے عبارت ہی، مشاق تھے۔ مرتبہ امارت آنا بلند تھا کہ خود امرا اداون کی صحبت میں تھے۔ میر سوز اور سودا کے شاگرد تھے۔ موسیقی میں بہت سے راگ نصیف کیئے تھے۔ فن تیر اندازی میں بھی میر سوز کے شاگرد تھے۔ اور اس فن میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ شمیر شناسی۔ ادب شناسی اور مردم شناسی بھی میر موصوف کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ دیکھو ادب شناسی اور انسان کی قدر دانی بھی اس زمانہ میں فن تھے جو استادوں سے حاصل کیئے جاتے تھے۔ اس بیان سے خود میر سوز کے کمالات کی نیز گئی معلوم ہوتی ہے۔ میر منظر علی۔ "پاکیزہ سرشت و نیک شعار"۔ جولانے ست بعلم و عمل آراستہ و بصلاً

و تقویٰ پیراستہ“ سجاد“ موصوف باوصاف حمیدہ۔ مخلوق باخلاق بنجیدہ۔۔۔ در لطیفہ گویاں۔۔۔ طاق۔ در ہر امور کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ۔ علم طب ہم محل نمودہ۔۔۔۔۔ طلسمات۔ دانشا و خوش نویسی و شعر فہمی بہر اعلیٰ رسانیدہ“ شوق۔“ مرد سپاہی پیشہ۔ صاحب یوان۔ از شاگردان سراج الدین علی خاں آرزو۔ مدستہ د سرکار نواب عماد الملک غازی الدین خاں بوسیئلہ سپہ گری بسر بردہ“ شاعر“ جو انے ست بکمال صلاحیت آراستہ و بہ علم و عمل پیراستہ۔ اہل دل۔ منصف۔ متواضع مؤدب۔ بزرگ و بزرگ زادہ“ نواب عماد الملک غازی الدین خاں (ایک اور امیر)“ بر جمیع علوم قادر و در فنون سخن ماہر از وزرے ہندوستان۔۔۔۔۔ بود۔۔۔۔۔ ہفت قلم و ہفت زبان“ فغان۔“ خان ظریف طبع۔ و خوش خلق۔ باہر کس خوش طبعی داشت۔۔۔۔۔ لطائف و ظرائف او مشہورست“ گریاں۔“ جو انے ست شائستہ۔۔۔۔۔ سپاہی پیشہ“ وحشت۔“ سید زادہ خوش اوقات و نیک صفات۔ جوان وضع دار و در فن سپہ گری استوار“ لالہ نول رے وفا۔“ از تذکرہ محمد قائم چنان ظاہرست کہ جو انے ست نوحاستہ۔ بزبور علم و عمل آراستہ۔۔۔۔۔ صاحب علم و حیا۔ لطافت مزاج از گل زیادہ۔۔۔۔۔ برادر خوردش اچہ گلاب رے دیوان مدار المہام امیر الدولہ نواب نجیب خاں مرحوم بود۔ لیکن این عنصر زیر مصروف اکتساب و غرق مطالعہ کتاب۔ طلب ہر کمال دامن گیر حال۔ طبع در دمن داشت“ یہ نہ خیال کرنا کہ میر حسن صاحب کے یہاں حسن بیان و حسن ظن کا دفتر کھلا ہوا ہی اور ہر شخص سند تعریف سے سرفراز ہوتا ہی۔ اہل یہ ہی کہ وہی کھا ہی جو خود دیکھا یا دوستان حقیقت داں سے سنا۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھ دیا ہے۔ ”پس از دریافت حال خیر مال صاحب سخن شہ کہ از دوستان حقیقت داں سمع نمودہ در ذیل اشعار ہر یک نوشت“ ایسے شعر ابھی ہیں جن کی اخلاقی حالت معلوم نہ ہوئی ان کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ مثلاً مصحفی۔ ان کے کلام کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف کی ہے۔ مگر اخلاقی حالت چونکہ معلوم نہ تھی اس لیے صرف اس قدر لکھا ہے۔ ”از تخلص معلوم می شود کہ مرد صالح ست“

مذکورہ بالا اقباس اہل انصاف کو اس امر کا معترف کرنے میں کامیاب ہو گا کہ شعرائے ماضی کو ہمیدہ حال نہ تھے۔ بلکہ علم و اخلاق سے آراستہ انسان تھے۔ کیا اس سوال کا موقع ہے کہ آج کل کے مدعیان کمال کہاں تکہ علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں؟

بزرگانِ دین کی توجہ ادبِ اردو پر | عام خیال یہ ہے کہ بزرگانِ دین و علمائے اردو ادب کی جانب توجہ نہیں فرمائی۔ اس خیال کو واقعات سے مطابق کیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو

ادب شروع سے حضراتِ اولیاء کے کلام کی آغوشِ شفقت میں تربیت پائی ہے۔ ریختہ کے استادِ اول (بقولِ میر) ولی دکنی ہیں۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں کی شہادت ہے کہ دکنی میں اگر حضرت شاہ گلشن قدس سہرہ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اور فیض حاصل کیا۔ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگین استعمال کرنے کا مشورہ حضرت ہی نے دیا۔ حیرن کی اصل عبارت: "ولی از خاکِ گجرات در وقتِ عالم گیر بہ ہندوستان جنت نشا" آمدہ در خدمتِ شاہ گلشن قدس سہرہ استفادہ حاصل نمودہ۔ از توجہ آں بزرگوار مقبولِ اعلیٰ و ادنیٰ گردید۔ اردو شاعری کے تیسرے دور کے ارکان چار گانہ میں سے دو رکن وہ عالی مرتبہ بزرگ ہیں جن کی تعلیم سے ہزاروں انسان زندگی کے مقصد سے واقف اور شاہدِ مقصود کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ یعنی حضرت خواجہ میر درد اور حضرت میرزا مظہر جان جاناں قدس سرہما۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ یہ شوقِ حضراتِ نقشبندی سلسلے میں اس طرح اردو ادب کا نقشِ اول و ثالث حضراتِ نقشبندیہ کی توجہ کا منت پذیر ہے۔ آزاد آپ حیات میں لکھتے ہیں: "اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے جنہوں نے زبانِ اردو کو خراطِ امارا ہی؟ آخر الذکر دونوں حضرات نے گونا گوں اسلوبوں سے ادبِ اردو کو ترقی بخشی۔ خود استادانہ کلام کہا۔ اپنے فیضِ اثر سے اس کو مقبول بنایا۔ شاگردوں کی تربیت کی۔ حضرت خواجہ میر درد کو دیکھو۔ خود قادر الکلام استاد ہیں۔ چھوٹے بھائی اثر ہیں۔ صاحبزادہ آلم۔ قائم چاند پوری اور بھکاری داس غریزہ زمرہ تلامذہ میں ہیں۔ میر حسن نے حضرت ہی کی خدمت میں ذوقِ سخن کی چنگی چھلکی تھی۔ حضرت میرزا صاحب خود استاد فن یقین و خزینہ زمرہ تلامذہ میں۔ ان حضرات کے علاوہ الہ آباد کے دائرے سے بھی اس ذوق سے پُر صدا تھے۔ حضرت شاہ اجل سجادہ نشین حضرت شاہ خوب اللہ اور ان کے برادر بزرگوار شاہ غلام قطب الدین مصیبت بھی شاعرانِ اردو میں شامل ہیں۔

ایک لطیف بحث | میر تقی میر نے اپنے کلام کا انتخاب نکاتِ شعرا میں کیج کیا ہے۔ میر صاحب کا کلام اُس پران کا انتخاب۔ سونے میں سہاگہ۔ مگر آفریں میر حسن کے انتخاب کو کہ میر کے کلام کا انتخاب خود میر سے بہتر کیا۔

مشتے نمونہ از خردارے - اشعار ذیل میر حسن کے انتخاب میں ہیں - میر صاحب کے انتخاب میں نہیں ۛ

کہا میں نے کتنا ہو گل کا بستا کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
بیاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا جیتے رہے تے کیوں ہم جو یہ مذاب دیکھا
لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹے ہی خیر - میر صاحب - کچھ تم نے خواب دیکھا
دل میں رنگ اڑ گیا میرا کیا بدانی کو منہ دکھاؤنگا

ان اشعار کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ ان اشعار کے ہم طرح اشعار میر کے تذکرہ میں نہیں ہیں اس لیے ممکن ہے کہ تزیب تذکرہ کے بعد کے ہوں اس لیے انتخاب میں نہ آئے ہوں - معرکہ یہ ہے کہ جن غزلوں کے اشعار منتخب کر کے خود میر صاحب نے لکھے ہیں ان ہی غزلوں سے بعض ایسے نادر اشعار میر حسن نے انتخاب کر لیے ہیں جو خود میر کے انتخاب سے زیادہ نادر ہیں - اور یہ ایک انسانی کمزوری کا پہلو ہے کہ بعض اوقات خود اپنے کمال پر وہ قلم پیر دیتا ہے - تذکروں میں لکھا ہے کہ زلاتی خوانساری کی معرکہ الاراشمنوی محمود ایاز کا مسودہ دیکھا گیا تو اُس میں بعض ایسے نادر اشعار زلاتی نے کاٹ دیئے تھے جو فارسی ادب کے لیے مایہ ناز ہیں - مثلاً - شب تار یک گل تشبہ میں یہ بے نظیر شعر ۛ

ستارہ می نمودے در میانہ

چو چشم گربہ در تار یک خانہ

ایسے متعدد اشعار اہل نظر احباب نے ثمنوی مذکور میں بعد کو اضافہ کر دیے ہیں -

خلاصہ کلام - نمونہ کلام مذکور ملاحظہ ہو - ایک غزل ہے - دیدار دیکھنا - گلزار دیکھنا - اس عنوان کے یہ اشعار

میر نے انتخاب کیے ہیں ۛ

آنکھوں میں جو میرا ہی ایدہ مراد دیکھنا عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

ہونا نہ چار چشم دل اُس ظلم پیشہ سے ہشیار - زینہار - خبہ دار دیکھنا

میر حسن اسی غزل کے یہ شعر انتخاب کرتے ہیں ۛ

میتا دل ہے دلیغ بدانی سے رشکِ باغ تجھ کو بھی ہو نصیب - یہ گلزار دیکھنا

دوسری طرح - روتا رہیگا - سوتا رہیگا - اس غزل کے یہ شعر انتخاب میر میں ہیں ۛ

جو اس شور سے تیر روتا رہیگا تو ہمایہ کا ہے کو سوتا رہیگا
تو یوں گایاں غیر کو شوق سے کہیں کچھ کہیگا تو ہوتا رہیگا
میر حسن کے انتخاب میں یہ شعر ہے

میں نہ رونے والا چلا ہوں جاں سے جسے ابر ہر سال روتا رہیگا
ایک تیسری طرح ہے۔ یار افسوس۔ ہزار افسوس۔ انتخاب میر ہے
مر گیا میں ملانے یا ر افسوس آہ افسوس صد ہزار افسوس
یوں گنوتا ہی دل کوئی۔ مجھ کو گئے آتا ہے بار بار افسوس
انتخاب میر حسن ہے

رخصت سیرِ باغ ہمیں نہ ہوئی یوں ہی جاتی رہی ہزار افسوس
ایک چوتھی طرح۔ وفائے بل۔ جائے بل۔ انتخاب میر ہے
گل کی بجائی دیکھی۔ دیکھی وفائے بل ایک مشب پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بل
انتخاب میر حسن ہے

کی سیرِ مہذبِ لغت گلچیں نے گل چمن میں توڑا تماشا خِ گل کو بکلی صدائے بل
یہ شعر ایک دیوان پر جاری ہے۔ میر صاحب کا اس کو منتخب نہ کرنا سراپا حیرت ہے۔
میر حسن کے اس سخنِ انتخاب نے یقین ہی کہ ملایع کو ان کے انتخاب کا مشاق کر دیا ہوگا اس لئے دل چاہتا ہے
کہ اور انتخاب بھی ناظرینِ مقدمہ کی ضیافتِ طبع کے لئے یہاں لکھ دوں۔
میر حسن نے اپنے تذکرہ میں زندہ و مردہ دونوں کو غایتِ شفقت کے ساتھ دعائے خیر سے یاد کیا ہے۔ اور دیا چہ
عرضِ تالیف تذکرہ بھی یہی لکھی ہے کہ اس کو پڑھ کر شاید کوئی مجھ کو دعائے خیر سے یاد کرے۔ لہذا غائمہ مقدمہ پر دعا کرتا
ہوں۔ ناظرینِ آمین کہیں۔

اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَبَارِكْ فِي سَيِّئَاتِهِ

انتخاب اشعار

آبرو

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں اس طرح حال دل کا کتنا ہوں

دل کب آوارگی کو بھولا ہے خاک گر ہو گیا بگولا ہے

شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر آئینے ہو جائیں دیواروں میں دل

بس رخ اب خیال میں وہ جام ہو گیا ساتی۔ بیک نگاہ مرا کام ہو گیا

دردِ دل چھوڑ جائے سو کہاں اپنے باہر تو یاں گزر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

اثر کیجئے کیا کہ مر جائے مگر آپ ہی سے گزر جائے

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر مجھ میری وفا ہی اس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہو پر اثر کی ہیں تو اس نہیں

ماشتی اور عشق کی باتیں سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

جیوں تیوں اسد کو لائے تم اس کی گلی بزم خانہ خراب۔ راہ میں پر۔ پھر محل گیا

پوچھتے کیا ہو کہ بیدار کروں یا نہ کروں یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں

دعدہ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو دل کو اس دعدہ سے میں یاد کروں یا نہ کروں

مثال آئینہ ہم نے سبھی نقش جہاں دیکھا جہاں دیکھا ہر صورت تجھے قالب میں جاں دیکھا

قیامت کی عقوبت ساری ہجریاں میں گزری وہاں تمنا دیکھنا جو کچھ سو سب ہم نے یہاں دیکھا

ہوئے ہیں خاک سیر راہ اس کے ہم انشا بڑا غضب ہی جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

اُس کے اٹھتے ہی جی پہ آن بنی دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا

اب ہجر میں کتنا ہے کہ تمنا وصل میں آرام نالاں ہی بیاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

اثر

اسد

آزاد

ماٹھی

انشا

افسوس

بیان

ہیں بھی یاد وہ عہدِ شباب آتا ہی
جاتا ہی یا رکچہ تو بیاں منہ سی بولے
اے بے نصیب مانعِ گفتار کون ہی
ہو دیگا ذوقِ حسرتِ دیدار میں خلل
شیریں گزرنہ کیجئے فرہاد کی طرف

رباعی

سوطح سے یہ عشق لہجاتا ہی مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہی یا رب
ہر چیز میں آبلوہ دکھاتا ہی مجھے
ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہی مجھے

رباعی

دُنیا سے بیاں چلا ہوں روتے روتے
فلکات میں تھا آپ بقا پر افسوس
گزری شبِ عمر اپنی سوتے سوتے
روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے
دل چھین لیا میرا بارس کے بتوں نے
اُن کی مسند کی کیا کروں تقریر
عجب احوال ہی تاباں کا تیرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا
تری فریاد سے جیتا ہوں مرنے میں
آتا نہیں استبارِ دل کو
آپ کا جان کے سب بچھہ کرم کہتے ہیں
بات میں کس کی سنو آہ کہ لے مرغِ چمن
لے ستم ایجا دکب تک یہ ستم دیکھا کریں
کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ
چمن اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
حاتم بکس کا تجھ بن کون ہے
خاتمِ حزن
ہیں حزن
دیراں ہوا ہی بلغ خزاں سے میاں تلک

حسن

حیران
حسرت

نورنگہ - حیران - حیران - حیران

تمی ہیں سیر کوئی دن اسی میخانے کی
تیغ ابرو نے تو مارا ہی تھا جو زلف نہو
لے حسن آپ کو سمجھیکا تو کیا بس چپ
دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال
کے وہ اپنے منہ قتلِ حسرت کو کیا میں نے

قطعہ

تم جو کہتے ہو کہہ دو حسرت کو
آپ کا اس میں کیا بگڑتا ہے
عشق کب تک گ سینے میں مے بڑکا یگا
نو گرفتاری کے باعث مضطرب رہوں
قیامت مجھے شب اس ترحم اور ظلم تھا
ایسی ہی آہ باتیں اس بے وفائی چھریں
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہی میرا
چھوڑے کوئی کسی کے لیے جس طرح سے کچھ
کرتے تو مجھ کو قتل کیا ہی پر اب حسن
جزائشک بلل اب نہیں گلِ شاخار پر
اب جو چھوٹے ہی ہم نفس ہو تو کیا
مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا لگینیں
ہزار حریف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی
شبِ فراق میں دور کے دم گئے آخر
جانِ دل ہیں اس سی میرے

آہ و فزایاں کیا نہ کرے
دردِ دل کی کوئی دوا نہ کرے
راکھ تو میں ہو چکا کیا خاکِ آبِ سلائیگا
لگتے لگتے جی نفس میں بھی مرا لگ جائیگا
کبھی تھیں گایاں منہ پر کبھی لب پر تبسم تھا
روشنی روتے جس میں دُروصال گزرا
جیسے کوئی بھولے ہوئے پھر تا ہی کچھ اپنا
ہم نے منت میں تھی کون مکاں چھوڑ دیا
کیا کیا نہ اپنے جی سے وہ باتیں بنائیگا
کیا اس پر گئی ہی چمن میں بہار پر
ہو چکی واں بہار ہی آخر
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں
تمام عمر لگی پر قسم یہ سرنہ ہوئی
یہ رات جیسی تھی ویسی رہی نہ ہوئی
اٹھ گیا کون پاس سے میرے

جب نفس میں تھے تو تمی یا دچن ہو خوش
اب چمن میں ہیں تو میرا دقش آتی ہر
کیا ہنسنے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے
کنسنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی
پر ایک جان تو ہے جس بن نہیں گزرتی
کچھ ہونہ ہوئے ہو تیرا خیال ہر دم
اس بن نہیں گزرتی اس بن نہیں گزرتی
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس لے زندگی ایسی ہستی سے گزے

رباعی

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں
چاہت میں کسی کی ہیں نہ بیزاری میں
حیرت کدہ دہر میں تصویر کی طرح
سویا کرتے ہیں عسین بیداری میں
پہنچے نہ حسن منزل مقصود کو ہم۔ اور
آخر ہوئے سب زلیست کے ایام سفر میں
کرم اللہ ظہاں درد اگر وہ بت کسی صورت میرا رام ہو جائے
تو پوچھو اس عقیدت کے کفر اسلام ہو جائے
تری ترچھی نگاہوں نے نکما ہی نسیم بلکہ
اگر ہر کر نظر دیکھے تو میرا کام ہو جائے
تعل آتش غم میں دل بیتاب کیا جانے
ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیاب کیا جانے
کناسے سے کنارہ کب بلا ہی بحر کا یارو
پلک لگنے کی لذت دیدہ پُر آب کیا جانے
حضرت لاجپور درد خواب ہم سے چپکے تو ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
بالمے مجھے بتاؤ نہسی کیا سبب ہوا
پھر ٹھپہ مہربان ہوا تو غضب ہوا
کی تو تمی تاثیر آہ آتیش نے اس کو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے اکہ کایاں ڈھیر تھا
مدرسہ یادیر یا کعبہ تالیات خانہ بھتا
ہم سب ہی مہمان تھے وہاں تو ہی صاحب خانہ تھا
دائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
ہو گیا مہاں سہراے کثرت موہوم آہ
وہ دل خالی کہ تیرا خاص غلوت خانہ تھا
جان سے ہو گئے بدن حنائی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

اُن لبوں نے نہ کی میسجائی
 ہم نے سو سوطح سے مرد کیا
 تجھی کو جو یاں جلوہ فرمانہ دیکھا
 برابر ہی دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
 سینہ و دل حسرتوں سی چھا گیا
 بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا
 تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا
 پردہ کیا کچھ تھا کہ دل کو بھا گیا
 کسی سے کیا بیاں کیجے اس اپنے حال ابر کا
 دل اس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جاننا پہچانا
 دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
 در نہ کچھ طاعت کی خاطر کم نہ تھے کرد بیاں
 ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں
 دل ہی نہیں ہا ہی جو کچھ آرزو کریں
 مٹ جائیں یک دم میں یہ کثرت نمایاں
 گر آئینہ کے سامنے ہم ایک ہو کریں
 تیسے سوا نہیں کوئی دو جہان میں
 موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے لگان میں
 کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بونہ ہو
 کس کام کا وہ دل ہی کہ جس دل میں نہ ہو
 اپنے بندوں پہ جو کچھ پا ہو سو بیدا کر دے
 پر نہ آجائے کبھی جی میں کہ آزاد کر دے
 اس مستی خراب سو کیا کام تھا ہیر
 لے نشہ ظہور یہ تیری ترنگ ہی
 تمنا ہی تیری اگر نہ تمنا
 رہنے ہی نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
 تری آرزو ہی اگر آرزو ہی
 نہ وہ نالوں کی شورش ہی نہ وہ آہوں کی ہوشیاری
 لے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
 ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحا لیکن
 کچھ لانے نہ تھے کہ کھو گئے ہم
 جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی
 دباچی تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم
 جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی
 ساتھ اپنے دو چار ہو گئے ہم

رباعی

لے در دیہ درد جی سے کھونا معلوم
 جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
 گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
 میرے جی کا شگفتہ ہونا معلوم

رباعی

میری چلی اور گئی جوانی اپنی اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کر گیا اس کو کہتے ہیں ہم آپ اب کہانی اپنی
درخشاں - تھی درائے ناتہ ایسے کی ہر دم یہ صدا آہ مجنوں پاؤں سے گھس گیا محل سے دور
رہنوا رہنوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
وصل میں بخود ہے اور ہجر میں بیابان ہو ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے
وہ کون سی زمیں جو اسکوں سے تم نہیں اس دوانے دل کو رہنوا کس طرح سمجھائیے
دیگر رادرفقاری شریک ماکن رسوا ہی اس زمانہ میں مجنوں سے کم نہیں
سینے سے دماغ عشق مٹایا نہ جائیگا مدعا گر شہرت حسن ست یک رسوا بس ست
پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب ہم سے تو یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا
سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے ملک میں دامن ضحیٰ یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہی مجھے
رہنما ہو گی کبھی اے چرخ ہماری بھی شام ضحیٰ

قطعہ

اے باغیاں نہیں تھے گلشن سے کچھ غرض ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ و برگ کیس
اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب آپس میں درد دل کیس ٹاک بٹھکر کیس
کے کیا درد دل بلبل گلوں سے اڑا دیتے ہیں اس کی بات ہنس کر
دنیا میں کوئی تجھ سا تمگہ نہیں ہے بے رحم جفا پیشہ و خوشنوا نہیں ہے
چھوٹ جا دیں غم سے ہر دم کے جو بچکے دکھیر خاک ہی یہ زندگی جو تم کہیں در ہم کیس
ایک ن آگے ہی دنیا سیٹھا ہم کو شبِ فراق تو اسی نہ دکھانا ہم کو
ہمیں تو فرش سے اور تکیہ محل سے بہتر ہے گلی میں اس کی پڑ رہنا سر ہانے ہاتھ کو دھر کے
نہیں ہی تاج مجھ تیرے سامنے جانا کہاں سراج کہاں قلاب عالم تاب
ادس بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی جس ات چاند نہیں ہر ستاروں کی کیا کمی

لڑتا ہی تب سے انجانوں پہ دل
 کہ کیا ثابت قدم ہی کیوں نہو آخر سر آج اپنا
 ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا
 پرگلی میں تری مجھے آنا
 جنگل میں آب ہی نکل کر تمام شہر
 آن میں کچھ ہی آن میں کچھ ہی
 آئینہ نے کے آپ کو دیکھے ہی تو ہنوز
 جلوہ گریا مراد ورنہ کہاں ہی کہ نہیں
 اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے
 زاہد تجھے قسم ہی جو تو ہو تو کیا کرے
 تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہو سکے
 ترپے ہی مرغ قبلہ نما آشیانے میں
 یہ عارض گل نہو دینگے عبث سبزہ بھی کھوتے ہو
 اک دُج ہی کہ وہ تہرہ آفت ہی غضب ہی
 ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پہلے گئے
 لے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
 سادگی دیکھ کے اس پر بھی لگا جاتا ہوں
 کیا زمانے کا انقلاب ہوا
 آج مجھ سے کا پھر جواب ہوا
 آہ یارب از دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا
 ترپنے کے سوا کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا

شعلہ خوبک نظر آتا نہیں
 ظالم مجکو جلتا دیکھ کر اتنا نہیں کہتا

دانش جو سر لوح ترانام نہوتا

جان دل سب قبول ہی بنا

اس فصل گل میں حبش جنوں کا ہوا ہی قہر

اس زمانے میں دوستی کا رنگ

سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا

غیر کے پاس یہ اپنا ہی لگا کہ نہیں

فکرِ معاش کی ریتاں یادِ رفتگیاں

گر ہوشِ رابِ غلوت و مشوقِ خوب

عشرت سے دوجاں کی یل لے لے دھو

نادک فی تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

مندا کر خط تم اپنے حق میں کیوں گاہوں کو بکتے ہو

صورت میں تو ہمتا نہیں اب کوئی کب ہے

پوچھے ہی پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب

گل چھینکے ہی عالم کی طرٹ بلکہ مڑ بھی

نہ ملطف نہ مروت نہ محبت نہ وفا

یار یوں تو درجا ہے اللہ

سوز کچھ منہ بنائے آتا ہے

اہل یاں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا

سعادت
 سجد

سودا

محمد میر سوز

شاعر
ضیا

مٹل نے ہر استخاں میں درو کی آواز
اپنے مطلب کی کہے جانگے ہم
کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی ایڑنگ
مجھ ساندہ نہیں خدائی میں
آہستہ پاؤں رکھیوے بونے گل چمن پر
اک تبسم میں کیا خلق کو ساری تسخیر
کون سے زخم کا کھلا ٹانھا
کبھی جاگل کو دیکھے میں کبھی دیکھے ہیں زگس کو
ہم نہ مٹم نہ ہم نہ سال ہوئے
دل کے جلنے پر نہ کی رقت کسی نے رحم سے
کعبہ میں چھپ رہا ہی یادیر میں نہا ہے
کیا کہا قاصد ضیا سنتے ہی جس کے مر گیا
چشم گریاں حسن سے معمور ہی
بات اب امتحان پر آئی
کنے کو ادھر ادھر گئے ہم
تھا کعبہ و دیر سے کسے کام
ایسروں قسم تجکو صبا ج کہہ کہ گلشن میں
زندگی مہج آب ہے گویا
دل بنگی نفس سے میاں تک ہوئی مجھے
یہ امتحان نہ کرے میسے مہربان عزیز
فغاں کو وصل میں رام کیا ہو

مہور
مرزا عسکری
عشق

فراق
نصیر
فغاں

کچھ نہیں معلوم یا رب سوز ہی یا ساز ہی
گرچہ سوار نہیں کیجئے گا
اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا
ہاتھ سے لے صنم نہ کھو مجھ کو
سوتے ہیں اس نہیں میں نازک دماغ کتنے
مُسکرا نا ہو ترایا کہ کوئی افسوں ہی
آج پھر دل میں درد ہوتا ہی
خدا جانے یہ چشم اپنی پھرے ہی ڈھونڈتی کس کو
اُگتے ہی ہم تو پا کمال ہوئے
خود بخود جل بل یہ انگار ادھک کر رہ گیا
خانہ خراب جلدی تو بول اٹھ کہاں ہی
بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا
چاندنی برسات کی مشہور ہی
قصہ کوتاہ جان پر آئی
تھے تیری طرف جد ہر گئے ہم
مقصود تھا وہ جد ہر گئے ہم
کوئی اُن ہمنواؤں سے ہیں بھی یاد کرتا ہی
دم کا آنا حب سب گویا
گویا کبھی چمن میں مرا آشیانہ نہ تھا
جہان میں کوئی تجھ سے رکھیگا جان عزیز
بدائی کا تصور بند ہو رہا ہی

فدوی
فارغ
انصاح

فتائم

فدوی مرا ہی کام ہی دوز اُنکے جسطح
آسک آنکھوں سے جو نکلا سوہ گوہر نکلا

کر یاد تجھے جد ہر گئے ہم

سر نہ چشم جہاں میں ہونا

ان نوں چسپ پر نہیں یہ مہر

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات

در د دل کچھ کہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی نام ہو

یہ کہی تو قاصد کہ ہی پیغام کسی کا

ہم نے ہر طرح ہجر میں دل شاد کیا

کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہی اسو

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو جسم کر

خوب نکلے ہم اُس کے کوچ سے

آہ اے پر چنچ فتائم نام

بے شغل نہ زندگی بسر کر

کچھ طرفہ مرض ہی زندگی بھی

وہ محو ہوں کہ مثالِ جناب آئینہ

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں

میں کہا۔ عمد کیا کیا تھارات

ناز واد اکیں کہیں عجب دنیا زہی

حسرتِ دل کو میری سمجھے ہی نہ

رکھتا ہوں تمام تمام دل بقرار کو

بعدت کے مری چشم کا جوہر نکلا

ہم تو نہ رہے کد ہر گئے ہم

خاک ساری کی کرامت دیکھی

گو دین کا گڑی لئے ہی سپہر

کالے کتل میں ات کالے رات

آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

کیا کہوں پر رہا نہیں جاتا

پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا

ہچکی آئی تو یہ سمجھے کہ ہیں یاد کیا

ما تم قس کیا یا عنم فرما دیا

روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات

یاں جو رہتا تھا اک جواں ہی یاد

گر آسک نہیں تو آہ سر کر

اس سے جو کوئی جیا تو مر کر

جگر سے آسک نخل تم رہا ہی آنکھوں میں

یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہی

یار نے آکے دم باز پسین کیا ہی

پر اُسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہے
صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے
جی دیکھتے تو دیکھتے پر دل نہ دیکھتے
جو بوند تھی آنسو کی سوہیرے کی کنی تھی
حسرت دل سو طرف سے اس کے دامن گیر ہے
کہ بلبلا سا کہیں آپ ہی بہانہ پھرے
ہی یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں
زلغ و زغن کے ساتھ کیا ہم نقش مجھے
کچھ رکھا جاتا ہی دل گردے دیرانے کی
شمع روشن کر دین غاک پہ پڑانے کی
سرمشق زلف کاں مرا لمحہ فرار تھا
قدرت میں کیا کہوں یہی شہسوار تھا
جو شرر دل سے اٹھا سو جلوہ طاؤس ہے
تا مٹ نہ چکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم
تیر بیداد جد ہر زد کرے گھر اُس کا ہی
کیا چھوٹا دیا تو نے صبا کان میں گل کے
سو چاک دینے جس نے گریبان میں گل کے

رباعی

زاہد عابد سے دُور چٹکی چٹکی
یہ دُختر ز بھی جس سوا کی انگلی
وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ ننگ تھا

گو کہیں یارِ بلایا ہر وہ اب آتا ہے
شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا ہوتی ہے
مر جائے کسی سے پراغت نہ کچھ
شبِ گریہ سے وابستہ مری دل شکنی تھی
مردنِ دشواریں یہ جان بے تقصیر ہے
فلکے لائے تو ہی ہم کو لیکت ڈر ہے
مجھ سا کوئی جہان میں آشفقہ سر نہیں
تاقم میں عندلیب خوش آہنگاؤں
آج لے گریہ خبر لے مے دیوانے کی
آج کی ات جو اُس گل کا میسر ہو صا
اہلِ عدم کو رمز فنا کا تاکب شعور
تڑپوں خونِ غاکِ خون میں آج کے وار
کس کی نیزگی یہ شمع پڑوہ فانوس ہے
جو نقش قدم میں ترے وہ غاک نشیں ہم
سینہ اُس کا ہی دل اُس کا ہی جگر اُس کا ہی
یوں بندِ قبائل گئے جو آن میں گل کے
کیا کچھ دلِ نبیل پہ کرے دیکھیے یہ عشق

قدرت

قربان

کافر

کیا پھرتی ہی میکدے میں ٹٹکی ٹٹکی
قاضی کا نہ ڈرنے محتسب کا کافر
آتی دل پہ قتلِ مینا سے اب شکست

کلیم

گمان

مدت سے ہو رہا تھا مردانہ دل
اس گل کے دیکھتے ہی ہوا باغ باغ دل
فیض گل سے پھر ہوا اب گرم بازارِ چین
مشت پر لے کر ہوئی بیل خریدارِ چین
مجھے تو زیت بھی دشوار ہوئی ہوا
خدا کرے کہ گمانِ دل مرا بھل جائے
قتل کر مجھ کو مری نفس پہ بولا قاتل
ہائے یارو یہ گمان تھا مجھے معلوم نہ تھا

گرایاں

دیکھے تو جسے نگاہ بھر کر
سبک دہی یہ پر دلنے کی جی کو داغ کرتی ہے
ہم نے کیا کیا نہ تھے ہجرِ محبِ کیا

مضمون

میرمد اللہ - زندہ - اشک آنکھ سے دل ہاتھ سچی تن سی چلا جا
مجموعہ نہیں ہی مجھ کو بتوں کی ادا ہنوز

منقسم

تصویر اس کی کھینچ کے ناز و اداسے ساتھ
کیا دن تھے وہ کہیاں بھی دل آرمیدہ

محمد تقی - میر

قاصد جو داں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم

جی گیا تیر کا اس لیت و حل میں لیکن
کہاں آتے تیر تجھ کو تجھ سے خود نہا اتنے

کہا میں نے گل کا ہی کتنا نیا

صیا و دل ہی دلِ جدائی ہوڑ کا

میں وہ رٹنے والا چلا ہوں جاں سے

بتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے

گزارا بنا سے چرخ سے نالہ بچا ہ کا

مرا دے وہیں وہ آہ بھر کر
کہ دوشِ شمع پر رکھتا نہیں بارِ کفن اپنا

صبرِ توب کیا گریہ یعقوب کیا

اے دل کے نگین نقشِ ہی نام خدا ہنوز

نازاں ہی اپنے آپ پہ دستِ قضا ہنوز

رو آشیان طائرِ رنگ پریدہ تھا

بیچارہ گریہ ناک گریباں پریدہ تھا

عمر گزری کہ وہ گلزار کا باہا ہی گیا

نہ گیا ظلم ہی تجھ سے نہ بہانا ہی گیا

یہ حسن اتفاق - آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

کلی نے یہ سن کر مہم کیا

تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

جسے ابر ہر سال و تار ہیگا

جیتے ہے تھے کیوں ہم جو یہ خداب دیکھا

ہی خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

خانہ خراب ہو جو اس دل کی چاہ کا

کیا جدائی کو منہ دکھاؤ گنا

سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

بزمِ جہاں میں دتے ہی دتے میں گل گیا

تیوری چسٹر حافی تو نے کیاں جی نکل گیا

کتا ہی - تیر - رنگ تو کچھ اب نکھر چلا

یوں ہی جاتی رہی ہمارا فوس

اک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جانے بلبل

توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

اے اشتیاق سیرِ چمن تیری کیا خبر

مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

کیا ربطِ محبت سے اُس آرامِ طلب کو

جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

آتا ہی جی ہمارا دردِ دیوار دیکھ کر

نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

پھر آپ ہی آپ سوچ کے کتا ہوں کیا کہوں

ٹہنی جو زرد بھی ہی سوشاخِ زعفران ہی

کتنے ہوبات کس سے وہ آپ میں کہاں ہی

اس طرح کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

گل گلزار کیا درکار ہی گو عنسریاں کو

ہم ہیں فارغ ہوئے شتابی سے

مگر تیر کو آرزو تھی کسی کی

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا

کھلانے میں جو بگڑی کچھ اُگلے تیر

ماندِ شمعِ آتشِ غم سے پھل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر

یہ چھڑ دیکھ - ہنس کے - رخِ زرد پر مے

رخصتِ سیرِ باغِ ہم کو نہ ہوئی

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی دفائے لبس

کی سیرِ جذباتِ لغت لکھیں نے کل چمن میں

ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے

مطرب نے پڑھی تھی عنزل اک میر کی شجہ

ہو گا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا سیر

مرتے ہیں تیری زگر سہماں دیکھ کر

جاتا ہے آسمان لئے کوچہ سے یار کے

رہی نہ گفتہ مرے دل میں ہستاں میری

آتا ہی جی میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں

نازِ چمن ہی ہی بلبل سے گو حنزاں ہی

از خویشِ رفته اکثر رہتا ہی تیرا س بن

جب نامِ ترا یہ بجے تب چشمِ مبارک

کوئی کاٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہی

کام تھے عشق میں بہت پر تیر

دوم نزع و غوار دی جان اُس نے

مرگیا کو کہن اسی عزم سے
کتنا خلافتِ عدہ ہوا ہو گا وہ کہ یاں
وہ کیا چیز ہی آہ جس کے لئے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
کوئی نا امیدانہ کرتے سناہ
بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرین
اُس کے کوچہ میں کر شور قیامت کا ذکر
اب جہاں آفتاب میں مسم ہیں
ڈوبے اچھلے ہی آفتاب ہنوز
ان دنوں یاروں کی نظروں سے نہاں تہو
آنکھ اوجھل ہوا اوجھل ہی
نومیدی اور امید سادات ہو گئی
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
ہمیں آپ سے بھی حبِ داکر چلے
سو تم سم سے منہ بھی چھپا کر چلے
نیک بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں
ایسے ہنگامے تو یاں دوز ہو گئے ہیں
یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے
کبھی دیکھا تھا تب کو دریا پر
خوش رہو تیر مری جان جہاں ہتے ہو

رباعی

ہر صبح غموں میں شام کی ہی ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
میت ایسے کو دل دیا تو نے
عارض اُس کے تھے عرقِ سیویں سحر بیگے ہوئے
محب
اُنکے قرعوں ہی ہم تجھ تک پہنچتی نہیں سناہ
ڈروں میں کس لئے بخش میں پیاریں کیا تھا
ممتاز
جھانے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
تیرے ہی واسطے آئے عدم سی ہم یاں تک
عشق میں عرضِ متنازع دیدار ہے
یاد اُس شخص کی اس دل میں بھری رہتی ہے

خونابہ کشتیِ مدام کی ہی ہم نے
مَرَم کے غرضِ تمام کی ہی ہم نے
لے مری جان کیا کیا تو نے
جس طرح شبنم سے دو گل برگِ تر بھیگے ہوئے
مانعِ پرواز ہیں طائر کے پر بھیگے ہوئے
میں اب خزاں کو روؤں بہا میں کیا تھا
اور اپنی خاطر امیدوار میں کیا تھا
دگر نہ ہستی ناپائدار میں کیا تھا
میرا ہی دستِ عامنہ پر مرے دیوار ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں پری رہتی ہے

مَحْتَرَمِ مُسْتَمِدِّ مَائِلِ مَعْصِفِ

مَحْتَرَمِ کیا بیاں کروں تجھ سے
نئے تک وصل کی ہی راہ میں
کتنا نہ تھا کہ باز آہرم کی اس تنہی سے
جہاں کا اُگل بنے وہ شوخ یارب

اس دلِ داغدار کی صورت
ہو مثل ایک دم ہزار اُمید
آخر کیا نہ عالم اک بے گناہ جی سے
مجھے تو اُس چمن کا خار و خس کر

وقفہ

اے پیکِ نگہ - دینِ تر ہے در پیش
دلِ حیراں کی مری دیکھئے صورت کیا ہو
ہو نہاںِ اغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے
آشیاں بندی کی تکلیف نہ کر ہم کو ہوس

مَجْدُوبِ چھوٹے اگر قفس سے تو خاموشیِ مصیفر
عجب قسمت ہو اپنے دل کی بازارِ محبت میں
نَاجِیِ اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
ولیِ پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا

دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہی در پیش
اب تو داں آئینہ ہی آٹھ پسر ہی در پیش
جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے
گر رہینگے کسی دیوارِ گلستاں کے تلے

صیاد نے سنایہ ترانا تو ہم رہے
جو کوئی صبح اُس کو لے گیا تو شام لے آیا
عارضی میری زندگانی ہے
شاید کہ اُسے حالِ مراد نہ آیا

رگِ یاقوت ہی موجِ بستم
فائدہ کیا اگر دِامِ نہیں
سوالِ آہستہ آہستہ جوابِ آہستہ آہستہ
ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو

جنت سے بہار کیونکہ جاوے
کرتی ہی نگہ جس قدر نازک پہ گرانی
شاید کہ مر گیا ہی کوئی خانہ خراب
داں کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں

زندگی جاہِ عیش ہی لیکن
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شعلت میں ہوس
اے جانِ ولی وعدہ دیدار کو اپنے
ہو حسنِ ترا ہمیشہ کیاں

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہو اُس کو
لگتا ہے محکوں آج یہ سارا جہاں خراب
حسنِ عمل پہ اپنے نہ پھول اس قدر کہ شیخ
دُشستِ وفا

دکھ نہ دے اس قدر فنا کی تیں
 آخرش دو بھی جان رکھتا ہی
 بس کہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم
 بسترِ گل پر ہی لڑاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم
 نکل کا وعدہ کر لیا ہی اُس نے اے محرم تو کیا
 یاں تو بتے تابی سے دل کی کج ہی مڑاں ہیں ہم
 نہ کشتی پار ہی بہہ کر گئی اپنی نہ دار آئی
 ہوئے ہیں عسرتِ دریا اُس گھڑی جب عینِ حارِ لئی
 شبِ روزِ وصل کو دیکھ کر عجب لیل و نہار تھا
 کبھی ہم سے یار کو لطف تھا کبھی ناز تھا کبھی پایہ تھا
 یک رنگ نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
 خیالِ چشمِ ابر کر کے تیرا
 زخمی بہک گل ہیں شہیدانِ کربلا
 اندھیر ہی جہاں میں کہ اشامیوں کے ہاتھ
 یار جائے سنگِ لوحِ تربتِ نصب کیجو آئینہ
 آفریں اے دستِ گستاخِ محبتِ آفریں
 یہ گریباں ایک ت سے گلے کا ہارتھا
 کوئی مسجد گیا کوئی خرابات
 گلزار کی منط ہے بیابانِ کربلا
 ہی سترِ یدہ شمعِ شبتانِ کربلا
 تا کوئی جانے کہ یہ حسرت کشِ دیدار تھا
 یہ گریباں ایک ت سے گلے کا ہارتھا

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

۱۶ نومبر ۱۹۲۱ء
حیدرآباد دکن

لارڈ میکالے کی یادداشت مسئلہ تعلیم پر

ترجمہ

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب - رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

مجلس تعلیمات کی جو تحریریں اس وقت (گورنر جنرل کی) کونسل کے سامنے پیش ہیں۔ میں نے ان کے تیار کرنے میں عدا کوئی حصہ نہیں لیا۔ کیوں کہ مجلس کے بعض اراکین کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک ان اصول کے مطابق ہے جنہیں پارلیمنٹ نے تسلیم میں نہیں کر دیا تھا۔ اور اگر یہ سمجھ ہو تو ہمیں اپنے موجودہ طریقہ تعلیم میں تبدیلی کرنے کے لئے ایک دوسرا قانون بنانا پڑے گا۔ لیکن میری یہ رائے نہیں ہے اور اسی واسطے میں نے مجلس تعلیمات کی مذکورہ بالا کردہائی میں (بحیثیت صدر نشین مجلس) شرکت نہیں کی تاکہ جب یہ مسئلہ کونسل میں آئے تو میں بحیثیت رکن کونسل آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون پارلیمنٹ کا مفہوم کیا جا رہا ہے اس کی تاویل کیا ہو سکتی ہے؟ قانون میں

لے ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ یادداشت نہایت اہم ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ تعلیم یا مسئلہ تعلیم پر کوئی کتاب کوئی رسالہ یا مضمون ایسا نہیں جس میں اس تحریر کا حوالہ نہ ہو۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جنہوں نے اس یادداشت کو ملاحظہ کیا ہو۔ اکثر اصحاب اس کے دیکھنے کے شائق تھے اور خاص کر ہمارے دوست حافظ ساجد علی صاحب عباسی (وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن) کا شدید اصرار تھا کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع ہو چوں کہ اس میں ذریعہ تعلیم اور عربی سنسکرت اور دیسی زبانوں کی بحث آ رہی ہے اور اسی پر موجودہ تعلیم کی بنیاد رکھی گئی ہے اس لئے ہم نے اس کا شائع کرنا مناسب اور ضروری خیال کیا (اڈیسرا)

کسی خاص زبان یا علم کی تعلیم دیئے جانے کے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف مصارف کی ایک مد اس غرض کے لئے علیحدہ کر دی گئی ہے کہ اس روپے سے علم ادب کے احیا اور ترقی دینے کا کام لیا جائے نیز ہندوستانی اہل علم کی ہمت افزائی اور سرکار انگریزی کے علاقوں میں علوم کی ترویج و اشاعت کی جائے اب تحت یہ پیش کی جاتی ہے بلکہ اس بات کو مسلم قرار دے لیا گیا ہے کہ علم ادب سے پارلیمنٹ کی مراد صرف سنکرت اور عربی علم ادب ہو سکتی ہے اور ہندوستانی اہل علم کے متغزل لقب کے وہ لوگ کسی طرح اہل نہیں ہو سکتے جنہیں ملن کے کلام لوک (صحیح) کے فلسفہ الہیات اور نیوٹن کی طبعیات سے آگئی ہے بلکہ اس لفظ کے مخاطب پارلیمنٹ کی نظر میں صرف وہ حضرات ہیں جنہوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں گنا گناؤں کے تمام طریق استعمال یا پر مشور سے مل جانے کے سارے بھید پڑھ لئے ہیں! مگر میرے نزدیک یہ کوئی قابل الطینان توجیہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ پاشائے مصر کچھ روپیہ اکیائے علوم اور اہل علم کی سرپرستی کے نام سے مخصوص کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زمانے میں ملک مصر یورپ کی قوموں سے علمی ترقی میں کیوں آگے تھا مگر اب ان سے بالکل پیچھے رہ گیا ہے۔ تو کیا اس پاشائے مصر کی سرپرستی علوم کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے علاقے کے لڑکوں کو سالہا سال تک قدیم خط تصویر کی تعلیم دلانی چاہتا ہے تاکہ وہ اساتذس دیوی کی کمائی میں جو نکتے پہناں ہیں ان کا سراغ لگائیں اور بیٹوں اور پیاؤں کی قدیم پرستش کی ایک ایک رسم کو کمال صحت کے ساتھ تحقیقات کرتے رہیں؟ اس کے برخلاف اگر وہ اپنی رعایا کو خط میخی کی عبارتیں پڑھنے کے بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبان اور وہ علوم سیکھنے کا حکم دے جو زیادہ تر انہیں زبانوں کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں تو کیا کوئی انصاف پسند آدمی اس پاشا کو یہ الزام دے گا کہ وہ سرپرستی علوم کے مقصد سے انحراف کرتا ہے؟

قدیم علوم کے مایوں کا جن الفاظ پر انحصار ہی اوّل تو ان کا وہ مطلب نہیں جو وہ نالنا چاہتے ہیں دوسرے فقرے کے آخری حصے سے قطعی طور پر ان کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے کیوں کہ پارلیمنٹ نے یہ ایک لاکھ روپیہ نہ صرف احیا علوم کے واسطے دیا ہے بلکہ ایک غرض یہ بھی ہے کہ اسے ”سرکار انگریزی کے علاقوں میں علوم کی ترویج و اشاعت میں“ صرف کیا جائے۔ اور یہی الفاظ ان تمام تبدیلیوں کو جائز ثابت کرنے کے لئے

کافی ہیں جن کے واسطے میں نے یہ بحث اٹھائی ہے۔ اب اگر کونسل کو مجھے اتفاق ہو تو کسی نئے قانون کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن اگر اراکین کونسل ان معنی میں مجھے اختلاف رکھتے ہوں تو میں ایک مختصر سا قانون مرتب کر دوں گا کہ سلاسلہ کے فرمان شاہی سے اس فقرے کو حذف کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ دقتیں پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن یہ تو محض ایک ضابطہ کی بات ہوئی۔ ہمیں پہلے اُس دوسری دلیل پر غور کرنا چاہیے جسے مشرقی علوم کے حامی پیش کرتے ہیں اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو پھر موجودہ طرز تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ ان صاحبوں کے ذہن نشین ہو گیا ہے کہ موجودہ طرز تعلیم کے جاری رکھنے پر ہی سرکاری حسنِ معاملت کا انحصار ہے اور اگر ہم مذکورہ بالا مذکورہ جواب تک عربی و سنسکرت کی ترقی میں صرف کرتے رہیں کسی دوسرے کام میں صرف کریں گے تو یہ گویا ایک قسم کی بدعہدی ہوگی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سے طریق استدلال سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں؟ سرکاری طور پر جو روپیہ علوم کی سرپرستی کے لئے دیا جاتا ہے اُس کی نوعیت اُسی قسم کے مصارف کی سی ہے جو سرکار لوگوں کے کسی حقیقی یا خیالی فائدہ کے واسطے ادا کرتی ہے۔ اب اگر ہم ایک صحت گاہ (سینی ٹوریم) ایسے مقام پر تعمیر کرادیں جس کی آب و ہوا کو ہم نے پہلے صحت بخش سمجھا تھا مگر بعد میں اس کے خلاف ثابت ہوا تو کیا ہم اس بات کے پابند ہو جائیں گے کہ وہ صحت گاہ اسی مقام پر رہے؟ یا یہ کہ اگر ہم ایک بند بنوانا شروع کریں اور کچھ عرصے بعد یہ دیکھکر کہ اسے وہاں بنوانے سے کوئی فائدہ نہیں، ہم اُس کی تعمیر روک دیں تو کیا ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کرنے کے مجرم قرار پائیں گے؟ لوگوں کے مالی حقوق کا بے شبہ پورا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ لیکن آج کل جو ان حقوق کا سرا سر بے وقت اور بے محل راگ الاپا جانے لگا ہے اس سے تو اندیشہ ہے کہ ان حقوق کو الٹا نقصان پہنچ جائے اگر لوگوں کے نام کا روپیہ بُری جگہ صرف کیا جائے اور پھر حجت یہ پیش کی جائے کہ چوں کہ وہ لوگوں کا حق ہے لہذا اس کے برے مصروف میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود اس ”حق“ کو قابلِ اعتراض ٹھیرانا چاہتے ہیں۔ اگر سرکار نے کسی شخص کے ساتھ حتیٰ وعدہ کیا ہے۔ وعدہ درکنار اگر کسی شخص اس بات کا اُمید و ابھی بنا دیا ہے کہ سنسکرت یا عربی کے پڑھنے یا پڑھانے کے معاوضہ میں سرکار اس کی کفالت کرے گی تو بیشک ہمیں اس شخص کے وسائلِ معاش کا لحاظ کرنا چاہیے بلکہ اس بارے میں اگر ہم اسرا

سے کام لیں تو بھی میرے نزدیک نسبت اس کے کہ سرکار کی صداقت پر حرف آئے یہ بے موقع فیاضی بہتر ہوگی لیکن یہ تقریر کہ سرکار خاص خاص علوم والہ کو پڑھانے کی پابند ہو چکی ہے (خواہ وہ علوم فرسودہ اور وہ زبانیں بیکار رہی کیوں نہ ہو گئی ہوں) میری دانست میں محض لایعنی ہواؤں تو کسی سرکاری تحریر میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے ثابت ہو کہ سرکار اس معاملے میں کوئی خاص عہد کر رہی ہے یا اس تعلیمی سرکار کا ہمیشہ کے واسطے ایک خاص مصرف مقرر کر چکی ہے۔ لیکن اگر ہمارے پیش رو ایسا کر جاتے تو بھی میں کہتا ہوں کہ ان مسائل میں وہ ہمیں اپنی ہدایات کا پابند بنانے کے ہرگز مجاز نہ تھے۔ مثلاً اگر گزشتہ صدی میں کسی حکومت کے اربابِ عل وعقد نے کمال وثوق کے ساتھ یہ قانون نافذ کر دیا ہو کہ اس کی رعایا کے ہر فرد کے ہمیشہ چھپ کا ٹیکا لگایا جائے گا۔ تو کیا ڈاکٹر جینر کے جدید اکتشافات کے بعد بھی اس حکومت کے جانشینوں کو مذکورہ بالا قانون کی پابندی کرنی فرض ہوگی، مجھے زیادہ عالی دماغ لوگ ان باتوں کے کچھ معنی سمجھتے ہوں گے ورنہ میرے خیال میں تو ایسے وعدے جن کے ایفا کا کسی کو مطالبہ نہ ہو اور نہ ان سے مخلصی کی کوئی صورت باقی ہو اور ایسے حقوقِ لاحقہ جو کسی پر لاحق نہ ہوتے ہوں، نیز ایسا تغلب جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ محض لفظ ہی لفظ ہیں کہ جب کسی بیجا بات کے جواز کی اور کوئی دلیل نہیں ملتی تو ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ اسی قسم کے رسمی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ میں اس ایک لاکھ روپے کے خرچ کو بالکل صاحب گورنر جنرل (معہ کونسل) کی اختیار کی شے سمجھتا ہوں کہ وہ اس طریق پر جو سب سے مناسب معلوم ہو یہ روپیہ ہندوستان میں ترقیِ علوم کے لئے صرف کریں۔ اور اس معاملے میں کہ آئندہ یہ روپیہ عربی و سنسکرت کی اشاعت میں صرف کیا جائے یا نہ کیا جائے، صاحب گورنر جنرل کو میں اسی طرح مختار کار سمجھتا ہوں جس طرح کہ وہ اس قسم کا حکم دینے کے مختار ہیں کہ آئندہ میسور میں شیر مارنے والوں کا انعام کم کر دیا جائے یا کلیسا میں مناجات خوانی کے لئے جو روپیہ سرکار سے دیا جاتا تھا وہ آئندہ موقوف کر دیا جائے۔

اب میں اہل مدعا کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہمارے پاس ایک سرمایہ اس غرض سے موجود ہے کہ اسے اہل ہند کی دماغی ترقی کے کام میں صرف کیا جائے۔ پس اصلی سوال یہ ہے کہ اسے صرف کرنے کی

سب سے بہتر صورت کیا ہوگی ؟

اس بات پر تو ہر فریق کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیسی زبانیں جو ہندوستان کے ان حصوں میں بولی جاتی ہیں ان میں نہ تو عام ادبی کتابیں ہیں نہ دیگر علوم طبعی - نیز یہ کہ وہ ایسی مفلس اور گنواہری ہیں کہ جب تک دوسری زبان سے مدد نہ لی جائے ان میں کسی اعلیٰ درجہ کی کتاب کا ترجمہ کرنا بھی دشوار ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ گویا مسلم ہو کہ ان ہندیوں کی دماغی تربیت کے لئے جنہیں اعلیٰ تعلیم کے دیگر ذرائع میسر ہیں ان میں اس وقت ناچار دیسی زبان کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ تعلیم اختیار کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی زبان ہو ؟ مجلس تعلیمات کے نصف اراکین کی رائے یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہونی چاہیے لیکن باقی نصف اراکین شد و مد کے ساتھ سنسکرت و عربی کی سفارش کرتے ہیں اور میرے نزدیک اصلی فیصلہ طلب امر یہی ہے کہ ان تین میں کون سی زبان سیکھنی سب سے زیادہ مفید اور مناسب ہوگی۔

خود مجھے عربی یا سنسکرت زبان نہیں آتی۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان زبانوں کی قدر قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کروں۔ میں نے سب سے مشہور عربی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے پڑھے ہیں۔ ان زبانوں کے متاثرہ عالموں سے یہاں اور انگلستان میں اکثر میری گفتگو ہوئی ہے۔ یہ متشقیقین علوم مشرقی کے متعلق جو رہے رکھتے ہیں میں اسے بخشنہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن ان میں آج تک مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو اس بات کا انکار کرے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں قدر و قیمت میں ہندوستان و عرب کے سارے علم ادب کے برابر ہیں! خود مجلس تعلیمات کے وہ اراکین جو مشرقی زبانوں کے حامی ہیں۔ مغربی علم ادب کی معنوی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس میں تو شاید کسی کو بھی اختلاف نہ ہو گا کہ علم ادب کی وہ شاخ جسے مشرقی ادیبوں نے سب سے زیادہ کمال کو پہنچایا ہے فن شاعری ہے۔ بایں ہمہ مجھے کبھی کسی ایسے مشرق سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جس نے دعویٰ کیا ہو کہ سنسکرت یا عربی شاعری کا یورپ کی بڑی بڑی قوموں کی شاعری سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے مگر جب ان خیالی

لے ان حصوں سے بنگال و بآریا جنوبی ہند کے بعض علاقے مراد ہیں۔ ہندوستان خاص کے بعض علاقے جن میں فارسی یا الہود زبان کا رواج تھا اس وقت تک براہ راست انگریزوں کے قبضے میں نہیں آئے تھے۔ مترجم

تصانیف کو چھوڑ کر ہم ان کتابوں کو دیکھتے ہیں جن میں تعاقب و واقعات اور عام کلیات قلمبند کئے جاتے ہیں تو میدان میں یورپ والے کیس آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ کتنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ انگلستان کے ابتدائی مدارس میں جو چھوٹے چھوٹے تاریخی خلاصے بچوں کو پڑھائے جاتے ہیں ان کی عملی قدر و قیمت اس تمام مجموعی معلومات سے جو ساری سنسکرت کتابوں سے حاصل ہوتی ہے زیادہ ہے۔ دونوں ملکوں میں قریب قریب یہی نسبت دیگر علوم و فنون کی کتابوں میں ہے۔

اب ہمیں اس معاملے پر از سر نو نظر ڈالنی چاہیے کہ ہم ایسے لوگوں کو تعلیم دینی چاہتے ہیں جن کو بالفعل ان کی مادری زبان میں تعلیم دینی ممکن نہیں۔ پس کسی غیر زبان کی تعلیم تو ناگزیر ہے۔ اسی کے ساتھ خود ہمارے زبان (انگریزی) کو جو وجود و ترجیح حاصل ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ کیوں کہ وہ (یعنی انگریزی) خود یورپ کی زبانوں میں نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اُس میں نظم کی ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جو قدیم یونان کی بہترین ادبی یادگاروں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ تاریخ پر ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اخلاقی اور فوری تربیت دینے کے معاملے میں تو ان کی کہیں نظیر نہیں ملتی اور محض طرز بیان کے اعتبار سے بھی شاید ہی کوئی کتاب اُن سے بہتر ہوگی اس میں انسانی فطرت اور زندگی کی صحیح اور منہ بولتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ مابعد الطبیعات اخلاق، سیاسیات، قانون اور تجارت وغیرہ ہر موضوع پر اس میں نہایت عمیق و جامع کتابیں ہیں۔ ایسے تمام علوم تجربی کے متعلق وافر و صحیح ذخیرہ جمع ہے جو حفظانِ صحت یا اسبابِ راحت کو بڑھاتے اور انسان کی عقل و ذہانت کو ترقی دیتے ہیں۔ جو شخص انگریزی جانتا ہے وہ دبلغ انسانی کی اُس بے حساب دولت تک رسائی رکھتا ہے جسے نہشت میں کرۂ ارض کی سب سے ماقبل قوموں نے پیدا اور جمع کیا ہے اور ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں وہ علوم جو زبان انگریزی میں آج موجود ہیں اس تمام مجموعی ذخیرے سے جو تین صدی پہلے دنیا کی ساری زبانوں میں جمع تھا کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہندوستان میں انگریزی حکمران طبقے کی زبان ہے حکومت کے صدر مقامات میں اعلیٰ رتبے کے دیسی باشندے تک انگریزی بولتے ہیں۔ قرینہ کتاب ہے کہ انگریزی ایشیائی سواحل پر بھی ایک سرے سے دیکھے تک تجارتی زبان ہو جائے گی۔ اُن دونوں یورپین قوموں کی بھی زبان انگریزی ہے جو ایک طرف آسٹریلیا اور دوسری طرف جنوبی افریقہ میں نشوونما پا رہی ہیں اور ہر سال اُن کا

اثر بڑھتا اور ہماری سلطنت ہند سے اُن کا تعلق قوی ہوتا جاتا ہے۔ الغرض کیا اپنی معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اور کیا ہندوستان کے محل وقوع اور خاص حالات کے لحاظ سے انگریزی زبان ہر طرح ہماری دیسی رعایا کے لئے دوسری تمام غیر زبانوں سے زیادہ مفید و کارآمد ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہم اس مفید زبان (انگریزی) کی تعلیم دے سکتے ہیں تو کیا پھر بھی ہمیں وہی زبانیں پڑھانی چاہئیں جن میں سیکھنے پر کسی مضمون کی ایسی کتابیں نہیں ہیں جن کا ہماری زبان کی کتابوں سے مقابلہ کیا جاسکے؟ کیا ایسی صورت میں جب کہ ہم یورپی سائنس کی تعلیم دے سکتے ہیں ہم وہی قدیم علوم پڑھائے جائیں جو کہ جدید علوم سے جہاں کہیں اختلاف رکھتے ہیں وہیں اُن میں نقص ہے۔ کیا ایسی صورت میں جب کہ ہم مفید فلسفے کی اور سچی تاریخ کی ترویج کر سکتے ہیں ہم سرکاری خرچ سے (مثلاً) انجمن طبعی اصول کی تعلیم دینی جائز رکھیں جو ایک انگریز نیم حکیم کے لئے بھی موجب حار ہیں، اسی علم نجوم کی تعلیم دیئے جائیں جسے پڑھکر انگلستان کے زمانہ مدرسے کی لڑکیوں تک کو ہنسی آجائے۔ یا ایسی تاریخ کی جس میں دس دس گزلبے بادشاہوں کے اوتیریں تین ہزار کے عہد حکومت کے قصے بھرے ہوئے ہیں۔ یا ایسے جغرافیے کی جس میں کھن اور شربت کے سمندر لرہیں مار رہے ہیں؟

اس معاملے میں ہماری رہنمائی کے واسطے نظر بھی موجود ہیں۔ تاریخ میں اسی قسم کی صورت حالات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور اُن سب سے ایک ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ ہم اگر زیادہ دُور نہ جائیں تو قریب ہی کے زمانہ میں دو یادگار مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ایسی قوموں کی جن میں پہلے جہالت و وحشت کا دُور دُور تھا، اتھوڑے ہی عرصے میں بالکل کایاپٹ ہو گئی۔ ان کا جہل و تعصب مٹ گیا بیداری پیدا ہوئی ذوق دُورست ہو گیا اور علم و فن کا قدم ملک میں جم گیا۔ ان میں سے پہلی مثال جس کی طرف میرا اشارہ ہے اُن مغربی اقوام کی ہے جن میں پندرہویں صدی عیسوی کے اخیر اور سولھویں کے آغاز میں علم ادب کا احیا ہوا۔ اُس وقت تمام قابل مطالعہ چیزیں قدیم اہل یونان و رومہ کی تصانیف میں پائی جاتی تھیں اور اگر ہمارے اجداد بھی مجلس تعلیمات کے مسلک پر عمل کرتے اور ٹیسی کٹس اور سسرود کی زبان کو چھوڑ کر اپنے جزیرہ (برطانیہ) ہی کی پڑنی بولیوں پر ساری توجہ مبذول رکھتے اور اپنے اعلیٰ مدارس میں انگریسی زبان کے ”وقت رائج“ اور

نارمن فریج زبان کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہ پڑھاتے تو کیا انگلستان کو یہ بات میسر آسکتی تھی کہ آج اس کے علم ادب کا پلہ دُور قدیم کی مستند تصانیف (کلاسیکس) سے بھاری ہے؟ اور اُس عہد کے انگریزوں میں جو حیثیت یونانی اور لاطینی زبان کی تھی، وہی موجودہ اہل ہند میں ہماری زبان کو حاصل ہے۔ بلکہ مجھے تو اس پر بھی شبہ ہے کہ ہمارے یکسں اور نارمن اسلاف کے پاس جیسا علمی سرمایہ تھا، سنسکرت میں اس کے برابر ہو سکتا ہے؟ بعض شاخوں میں، مثلاً تاریخ میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سنسکرت ان قدیم برطانوی السنہ سے بہت گری ہوئی ہے۔

احیاء علوم کی دوسری مثال گویا بالکل ہمارے سامنے کی بات ہی گزشتہ ایک صدی کے اندر ایک بڑی قوم جو ایسی دشنامت میں تھی جیسے صلیبی لڑائیوں سے قبل ہمارے (یعنی انگریزوں کے) اسلاف جل کے فاسے آہستہ آہستہ نکل آئی اور مذہب اقوام کی صف میں داخل ہو گئی۔ اس سے میری مراد روس کے لوگ ہیں جہاں اب تعلیم یافتہ افراد کا معقول گروہ ہو گیا ہے اور اس میں ایسے ایسے قابل اشخاص موجود ہیں کہ سلطنت کی بڑی سے بڑی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور اپنے اُن معاصرین سے جو پیرس و لندن کے بہترین حلقوں کی زیب و زینت ہیں کسی بات میں کم نہیں۔ اور یہ تو قح کرنا کسی طرح بیجا نہ ہو گا کہ یہ وسیع سلطنت (روس) جو ہمارے دادا پر دادا کے وقت میں غالباً ملک پنجاب سے بھی پس ماندہ تھی، ہمارے پوتے پر دوتوں کے زمانہ میں بہ اعتبار ترقی فرانس و برطانیہ سے ٹکا کھانے لگے گی۔ لیکن روس کے اس نمایاں تغیر کا سبب یہ نہیں ہے کہ قومی تعصبات کی تائید کی گئی یا روسی لڑکوں کو بڑی بوڑھیوں کی وہ کہانیاں اور سینٹ نکولاس کے وہ جھوٹے کارنلے سنائے گئے جنہیں ان کے جاہل اسلاف مانتے تھے۔ یا ایسے باریک مسائل کی تحقیقات کا انہیں شوق دلایا گیا کہ دنیا تیرہ ستمبر کے دن پیدا ہوئی تھی یا اور کسی دن اور پھر جو شخص ان علمی رموز سے واقف ہوا اسے ”ویسی فاضل“ کا لقب دیدیا گیا۔ نہیں بلکہ درحقیقت اہل روس میں یہ انقلاب اُن غیر زبانوں کی تعلیم سے پیدا ہوا ہے جن میں معلومات کے بتیرن ذخیرے بھرے ہیں اور جب روسیوں نے یہ (مغربی یورپ کی) زبانیں سیکھیں تو اس علمی ذخیرے تک اُن کی دسترس ہو گئی اور وہ شاید قوم بن گئے اور مجھے اس میں ذرہ شبہ نہیں کہ ان مغربی السنہ نے جو کام روسی تاتا اس کے حق میں کیا وہی ہندو (یعنی اہل ہند)

کے حق میں کر دکھائیں گی۔

غرض عقل و تجربہ دونوں اسی طرز عمل کو پسندیدہ ٹھہراتے ہیں لیکن اختلاف کرنے والوں کا قول ہے کہ ہمیں تعلیمی معاملات میں اپنی دیسی رعایا کو ہم آہنگ بنانا ضروری ہے اور یہ بات صرف عربی اور سنسکرت کی تعلیم دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے جواب میں سب سے اول تو مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ جب ایک ترقی یافتہ قوم کسی پس ماندہ اور کم علم قوم کی تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ لے تو پھر بھی طریق تعلیم کا انحصار اسی پس ماندہ اور سیکھنے والی قوم کی رائے پر رکھا جائے۔ مگر اس سے قطع نظر یہ چ پوچھئے تو مذکورہ بالا دیل پر کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کیوں کہ اس امر کی مسکت شہادت موجود ہے کہ موجودہ طریق تعلیم میں دیسی رعایا ہماری ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہ بات بجائے خود ناپسندیدہ ہے کہ ہم لوگوں کے ذوق کی خاطر ان کی دماغی صحت کا لحاظ نہ کریں۔ لیکن زیر بحث معاملے میں تو ہمیں ان کے ذوق کی پروا ہی نہ صحت کی۔ اس لئے کہ ہم صرف ان لوگوں کو وہ تعلیم دے رہے ہیں جس سے وہ بنیاد پر اور اس تعلیم کے دینے میں بخل کر رہے ہیں جس کی انہیں لی تناسل ہے۔ ثبوت اس قول کا یہ ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے والوں کو تو وظیفے دے دے کے پڑھانا پڑتا ہے اور انگریزی پڑھنے والے خود روپیہ دے دے کے ہم سے پڑھنے پر تیار ہیں۔ اور صرف یہی مسئلہ واقعہ کہ ہمیں اپنے وسیع مقبوضات میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں مل سکتا جو بغیر کچھ روپیہ لئے ہم سے اپنی مقدس زبانیں سیکھنی جائز رکھتا ہو، منصف مزاج آدمی کی نظر میں یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ سنسکرت و عربی سے لوگوں کی عقیدت اور ذوق شوق کے متعلق جو تقریریں کی جا رہی ہیں وہ کچھ وزن نہیں رکھتیں۔

اس وقت مدرسہ کلکتہ کے ایک مینیجمنٹ (دسمبر ۱۸۷۷ء) کے حسابات میرے سامنے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان میں سے ہر ایک کو سرکاری وظیفہ ملتا ہے جس کا کل خرچ پانچ سو روپیہ مینیجمنٹ سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف دج ہے کہ خرچ کی میزان میں سے نفی ایک سو تین سو انگریزی پڑھنے والے (برہمن) طلبہ سے گزشتہ مئی، جون اور جولائی میں وصول ہوا۔

بعض صاحبوں نے مجھے بتایا کہ چون کہ مجھے اس ملک کا تجربہ اور حالات سے واقفیت نہیں، اس لئے

طلبہ کا اس طرح وظائف لے کر پڑھنا دیکھ کر میں حیراں ہوا۔ حالانکہ ہندوستان میں یہ دستور ہی نہیں کہ طالب علم اپنے خرچ سے تعلیم حاصل کریں۔ مگر یہ سن کر مجھے اٹنا اپنی رائے میں زیادہ وثوق ہو گیا کیوں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی ایسا کام کرنے کے واسطے جسے لوگ اچھا اور فائدہ مند سمجھتے ہیں، اُن کو روپیہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہندوستان اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو بھی جب بھوکے ہوتے ہیں تو چاول کھلانے کے لئے یا سردی میں اُونی کپڑا پہنانے کے لئے روپیہ دینا نہیں پڑتا۔ اس سے بھی قریب مثال یہ ہے کہ وہ بچے جو دیہاتی اُستاد سے الف بے تے اور ابتدائی حساب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، کوئی وظیفہ اپنے اُستاد سے نہیں پاتے بلکہ خود اُستاد کو معاوضہ دیتے ہیں تو پھر عربی اور سنسکرت پڑھنے کے لئے لوگوں کو وظیفہ دینا ضروری کیوں ہے؟ صریحاً اس وجہ سے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان زبانوں کی تحصیل سے کوئی ایسا فائدہ نہیں ہوتا جو اس دردِ دوسری کا کافی صلہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے سب معاملات میں اصلی فیصلہ بازاری مانگ دیکھ کر ہوتا ہے۔

بائیں ہمہ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہو تو وہ بھی موجود ہے :-

گزشتہ سال ہی سنسکرت کالج کے چند قدیم طلبہ نے مجلس تعلیمات کو ایک عرضی دی تھی کہ عرضی گزاروں نے دس بارہ سال تک اس کالج میں تعلیم پائی۔ ہندو علوم و فنون سے واقفیت بہم پہنچائی اور فراغ التحصیل ہونے کی سند حاصل کی۔ لیکن اس سب کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ لکھتے ہیں کہ ان تمام اسناد کے باوجود وہیں اس بات کی بے کم اُمید ہے کہ مجلس تعلیمات کی دستگیری کے بغیر ہم اپنی فلاح کی کوئی صورت نکال سکیں گے۔ کیوں کہ ہمارے ہم وطن جس بے پروائی سے ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں اسے دیکھ کر ذرا بھی توقع نہیں رہتی کہ وہ ہماری کوئی ہمت افزائی یا امداد کریں گے۔ لہذا عرضی گزار درخواست کرتے ہیں کہ لاٹھ صاحب کے پاس اُن کی سفارشات

لے مکملے کے ان نتائج پر غالباً یہ لکھنا بے محل نہ ہو گا کہ ممالکِ مشرقی میں اعلیٰ تعلیم ایک مذہبی نوعیت رکھتی تھی اور اس کے استاد یا طلبہ مالی نوادہ کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔ اگر بادشاہ یا اُمرا کی طرف سے اس تعلیم کا اختتام ہوتا تھا تو وہ طلبہ کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا بھی پسندیدہ اور موجب ثواب جانتے تھے۔ خود اُستاد شاگردوں سے کسی قسم کی فیس یا مالی معاوضہ لینا گوارا نہ کرتے تھے اور طلبہ کے ترقی و علم کی دیں یہ ہے کہ وہ تعلیم کے واسطے دُور دراز کے سفر اور ہر قسم کی مشقت و محنت کو خوشی سے برداشت کر لیتے تھے۔ مترجم

کر دی جائے کہ کوئی سرکاری ملازمت مرحمت فرمائیں اور کوئی اعلیٰ یا بڑی تنخواہ کی ملازمت نہ ہو بلکہ صرف ایسی کہ ان کی بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم صرف بھلے آدمیوں کی طرح زندگی گزارنے اور تدریجی ترقی کرنے کا وسیلہ ڈھونڈتے لیکن سرکار کی مدد کے بغیر جس نے ہمیں لڑکپن سے پرورش کیا اور تعلیم دیوائی ہے ہمیں کوئی وسیلہ نہیں ملتا۔ اور آخر میں وہ بہت درد انگیز پیرائے میں لکھتے ہیں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ سرکار کا ہرگز یہ مشا نہیں ہو سکتا کہ زمانہ تعلیم میں اس قدر فیاضانہ برتاؤ کرنے کے بعد آخر میں ہمیں ایسی بیکسی کی حالت میں چھوڑ کر خود الگ ہو جائے !

سرکار کے نام عرضیاں تو ہیں نے بہت دیکھی ہیں جن میں عرضی گزار (بعض اوقات خواہ مخواہ بھی) کسی ایسے ضرر یا نقصان کی تلافی پتیا ہیں جو ان کے خیال میں انھیں سرکار سے پہنچا ہو۔ لیکن بے شبہ یہ پہلے عرضی گزار ہیں جو مفت میں تعلیم پانے کا معاوضہ طلب کر رہی ہیں۔ یعنی اس بات پر کہ ہم نے انھیں بارہ برس تک وظیفہ دیا اور پڑھا کھاکے دنیا میں داخل کیا وہ اُلٹا ہمیں سے تاوان مانگتے ہیں ! یہ الفاظ دیگر وہ اپنی تعلیم کو ایک ضرر کی صورت میں پیش کرتے ہیں جس کی تلافی چاہنے کا ان کو حق ہی اور جس کا وہ وظیفہ کسی طرح کافی معاوضہ نہ تھے جو اس ضرر رسی کے دوران میں انھیں ملتے رہی ! میں کہتا ہوں کہ بے شک ان کا دعویٰ ٹھیک ہی۔ انھوں نے زندگی کا بہترین زمانہ ایسی تعلیم میں صرف کیا جس سے نہ انھیں روٹی ملتی ہے نہ عزت۔ ان لوگوں کو بچا بنانے اور مصیبت میں پھنسانے سے تو بہتر تھا کہ ہم ان پر اتنا روپیہ خرچ نہ کرتے۔ لوگوں کو اپنے ہموطنوں پر ایک بوجھ اور ہساؤں کی نظر میں حقیر بنانا ایسا کون سا بڑا کام ہے جس کے لئے سرکار کو اتنا روپیہ صرف کرنا ضروری ہو ؟ لیکن ہماری حکمت عملی ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں ہم ایک طرف ملحدہ بھی کھڑے نہیں رہتے اور اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ اہل ہند اپنے موردنی ادا نام و نسب کے اثرات میں مبتلا رہیں۔ بلکہ ہم ان قدرتی مشکلات میں جو ایشیا میں سچے علم کی سדרہ ہیں اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہیں اور چھوٹے ملوم اور جھوٹے ذوق کے واسطے اس طرح بے دریغ وظیفہ و انعامات دے رہی ہیں کہ سچی تعلیم کی اشاعت کے لئے بھی اتنا اسراف نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر یہ کہ اس طرز عمل سے ہم اپنے لئے اُسی پریشانی کا سامان کر رہے ہیں جس سے بچنے کے واسطے ہم

بزم خودیہ طرز عمل اختیار کیلئے۔ یعنی ہم اُن لوگوں میں جواب تک مخالفت نہیں اپنی مخالفت کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ عربی اور سنسکرت کے مدرسوں پر روپیہ خرچ کرنا فقط حق کو امانت سے محروم رکھنا نہیں بلکہ باطل اور خطائے حامی پیدا کرنے کے لئے انعام بانٹنا ہی۔ اس خرچ سے ہم اُن لوگوں کا جھگتیار کر رہے ہیں جو محض نالایق نوکری کے بھکاری اور ساتھ ہی سخت متعصب بھی ہوں گے اور اسی تعصب اور ذاتی اغراض کی بنا پر تعلیم کی ہر مفید تجویز کے خلاف ہنگامہ بنا کر دیا کریں گے۔ اس وقت بھی اگر موجودہ طریقہ تعلیم بدلنے کی ایسی لوگوں میں مخالفت ہو تو وہ خود ہمارے طرز عمل کا نتیجہ ہوگی اور اس میں پیش پیش وہی لوگ ہوں گے جو ہم سے وظائف اور ہمارے مدارس میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ عرصہ تک ہم اپنے موجودہ طریق پر کاربند رہیں گے۔ اسی قدر زیادہ یہ مخالفت قوی ہوتی جائے گی۔ سال کے سال مخالفین کی فوج میں نئے سپاہیوں کا جنھیں تنخواہ ہم دے رہی ہیں اضافہ ہوتا رہیگا۔ خلاصہ یہ کہ دیسی باشندوں کو اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی دشواری پیش آنے کا اندیشہ نہیں جو کچھ چٹاں جنیں ہوگی وہ اسی گرو کی طرف سے ہوگی جس کے اغراض مشرقی تعلیم سے وابستہ ہیں اور جسے خود ہم نے مصنوعی تدابیر سے پیدا کیا اور قوت پہنچائی ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خود اہل ہند کے وہ خیالات نہیں جو قدیم علوم کے حامی بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی کافی ہے کہ مجلس تعلیمات نے تو عربی اور سنسکرت کتابیں چھاپنے کے واسطے ایک لاکھ سے کچھ ادھر روپیہ صرف کرنا ضروری سمجھا تھا لیکن اب ان کتابوں کے خریدار میسر نہیں آتے۔ غنا ذونا در کوئی نسخہ فروخت ہوتا ہی ورنہ مجلس کی الماریاں، بلکہ کتنا چاہئے کہ گودام، اُن تیس ہزار کتابوں کے اکثر بڑی سے بڑی تقطیع پر چھپی ہیں، پٹے پڑے ہیں۔ ہر چند مجلس مختلف تدبیریں نکالتی ہے کہ اس انبار عظیم سے کچھ تو بیک دوشی حاصل ہو لیکن وہ جس تیزی سے کتابیں چھاپ رہی ہے اس تیزی سے تعلیم نہیں کر سکتی اور ہر سال انھیں ردی کاغذوں کے تازہ انبار جمع کرنے میں ہزار کے قریب روپیہ خرچ ہوتا رہتا ہے حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم پہلے ہی اتنا بڑا ڈھیر جمع کر چکے ہیں کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ مجموعی طور پر گزشتہ تین سال میں تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ اس طریق پر صرف ہوا لیکن اس

مَدّت میں کتابوں کی فروخت سے آمدنی پوری ایک ہزار کی بھی نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں اسکول بیکس سائی انگریزی کی سات آٹھ ہزار کتابیں ہر سال فروخت کر لیتی ہے اور اسے نہ صرف مصارت طبع وصول ہو جاتی ہیں بلکہ اپنے سرمایہ پر میں فیصدی کا منافع بھی حاصل ہو رہا ہے۔

بعض حضرات اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ ہندوؤں کے قوانین بشیر سنکرت کتابوں سے اور اسلامی قانون کتب عربیہ سے لیکھا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس بات کا مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں۔ پارلیمنٹ ہمیں حکم دے چکی ہے کہ ہندوستان کے قوانین کی تحقیق و تفتیح کی جائے۔ ہماری مدد کے لئے تحقیقات قوانین کی ایک خاص جامعہ (کمیشن) بھی مقرر ہوئی ہے۔ پس جب ہمارا نیا مجموعہ قوانین مرتب اور نافذ ہو جائے گا تو کسی منصف یا صدر امین کو شاستروں کی یا ہدایہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور مجھے تو قلع اور پورا بھروسہ ہے کہ وہ لڑکے جو اس وقت عربی یا سنکرت کالج میں داخل ہو رہے ہیں اپنی تعلیم پوری نہ کرنے پائیں گے کہ مذکور بالا کام کی تکمیل ہو جائے گی۔ نظر برائیں کونسل کو ان حالات کے مطابق تعلیم دینے کا انتظام کرنا، جن کو ہم ان لڑکوں کے جوان ہونے سے پہلے بدل دینا چاہتے ہیں، صریحاً فضول ہے۔

مشرقی علوم کی حایت میں ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے جو اور بھی کمزور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربی اور سنکرت وہ زبانیں ہیں جن میں تقریباً دس کروڑ نفوس کی مقدس (آسمانی) کتابیں لکھی ہوئی ہیں اور اس بنا پر ان زبانوں کی بے تخصیص قدر ہونی چاہیے۔ لیکن ہندوستان میں اگر سرکار انگریزی کا فرض ہے کہ تمام مذہبی معاملات میں رواداری سے کام لے تو اسی کے ساتھ اُس کو بالکل غیر جانب دار بھی رہنا چاہیے۔ پس ایسی زبانوں کی تعلیم کو فروغ دینا جو بذات خود تو کچھ قابلِ قدر نہیں، البتہ اُن میں سب سے اہم مسائل (یعنی مسائل الہیات) میں سب سے سنگین خطایاں پائی جاتی ہیں کسی عقل و اخلاق اور اس غیر جانب داری کے بھی مطابق نہ ہو گا جسے نہایت احتیاط کے ساتھ قائم رکھنے پر ہم سب متفق ہیں۔۔۔

لے اس کے آگے مکاتے نے پھر اسی خیال کی وضاحت کی ہے اور اہل ہند کے مذاہب کو صاف صاف نفیوں میں جھوٹا قرار دیا ہے۔ اُس کے اعتراضات کا اصلی دھند مذہب معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مترجم کو ان خیالات کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا اور اسی لئے اس فقرے کی باقی دو، سطر میں جن میں مکاتے نے اپنے تعصب کو بہت نازیبا طریق پر ظاہر کیا تھا۔ حذف کر دی گئیں۔

مشرقی تعلیم کے حامیوں نے اس بات کو بالکل مُسلم سمجھ لیا ہے کہ ہندوستان کا کوئی باشندہ انگریزی زبان میں سولے شد بد کے زیادہ مہارت حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ مگر اس خیال کا جو ان کی تحریر میں جا بجا جھلکتا ہے انھوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا انگریزی زبان کے حامی جس تعلیم کی سفارش کرتے ہیں اُسے یہ مخالف حضرات محض ابتدائی تعلیم بتاتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے فرض کر لیا ہے کہ اس موقع پر ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ مشرقی تعلیم اور محض ابتدائی انگریزی تعلیم کا مقابلہ کرنا ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال محض وہم اور وہم بھی سرسر عقل اور تجربہ کے خلاف ہے۔ سب قوموں کے لوگ ہماری زبان سیکھتے ہیں اور اس قدر کافی واقفیت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ اس کے دقیق و خامص مضامین تک اُن کی رسائی ہو جاتی ہے اور ہمارے انشا پردازوں کی با محاورہ سے با محاورہ تحریر کے لطیف ترین کنایات اور حسن بیان کا وہ مزائینے لگتے ہیں۔ خود اس شہر (کلکتہ) میں ایسے دیسی موجود ہیں جو ہر قسم کے سیاسی اور علمی مضامین پر انگریزی زبان میں نہایت روانی اور صحت کے ساتھ بحث کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مسئلہ پر ہی میں نے بعض دیسی حضرات کو ایسی گفتگو کرتے سنا کہ مجلس تعلیمات کے فاضل اراکین بھی اگر اتنے وسیع الحیال اور باخبر ہوں تو اُن کے لئے موجبِ مباحثات ہی تھی کہ یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیر ملکی شاذ و نادر ہی ملیں گے جو انگریزی زبان میں اتنی صحت و سہولت سے اپنا مطلب ادا کر سکیں جس طرح کہ اکثر ہندوؤں کو ہم نے ادا کرتے دیکھا ہے۔ یہ دعویٰ تو شاید کوئی بھی نہ کرے گا کہ انگریزی زبان ہندوؤں کے لئے اتنی دشوار ہے جتنی کہ انگریزوں کے لئے یونانی۔ تاہم ایک ایک ہوشیار انگریز لڑکا اس مدت سے جو ہمارے بدنصیب ہندی طلبہ کو سنکرت کالج کا امتحان دینے میں درکار ہوتی ہے۔ کہیں کم وقت میں یونانی سیکھ لیتا ہے اور یونانی کے بہترین مُصنّفین کی انشا پردازی کا نہ صرف لطف اٹھاتا ہے بلکہ اپنی تحریر میں خاص طرح اُن کی نقل بھی اُڑانے لگتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جتنے عرصہ میں ایک انگریز طالب علم ہیرودوتس اور سکاکیس کی کتابیں پڑھنے کے لائق یونانی سیکھ سکتا ہے اس سے نصف یا اور بھی کم مدت میں ایک ہندو (یعنی ہندی طالب علم) کو اتنی انگریزی نہ آجائے کہ وہ ہیوم اور ملٹن کا مطالعہ کر سکے۔

جو کچھ میں نے عرض کیا اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو ہم (یعنی سرکارِ انگریزی) قانون پارلیمنٹ مجریہ شدہ کی رو سے مجبور ہیں اور نہ کسی علانیہ یا مضمحلہ کی بنا پر پابند ہیں کہ موجودہ تعلیم کو ہمیشہ جاری رکھیں۔

بـخلاف اس کے ہیں پورا اختیار ہے کہ اپنے تعلیمی سرمایہ کو جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ پس ہمیں یہ روپیہ انہی علوم کی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ مفید و کارآمد ہیں اور یہ ثابت ہے کہ سنسکرت اور عربی کی نسبت انگریزی کا جاننا زیادہ مفید اور مناسب ہے۔ خود دیسی باشندے انگریزی سیکھنے کے خواہاں ہیں اور سنسکرت یا عربی پڑھنی نہیں چاہتے اور قانونی یا مذہبی زبانیں ہونے کے اعتبار سے بھی عربی یا سنسکرت کسی خاص توجہ کی مستحق نہیں ہیں۔ نیز یہ بالکل ممکن ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت حاصل ہو جائے اور یہی ہماری کوششوں کا مقصود و مدعا ہونا چاہیے۔

طرز تعلیم کے متعلق جن صاحبوں کے عام خیالات سے میں نے اختلاف کیا۔ ایک بات میں اُن سے میں بالکل متفق ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارا موجودہ سرمایہ اس قدر کافی نہیں ہے کہ ہم جمہور اہل ہند کی تعلیم کا اہتمام کر سکیں پس ہمیں سہر دست صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کر دیں جو ہمارے اور ہماری کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام انجام دے سکے۔ یہ نئے تعلیم یافتہ رنگ و خون کے اعتبار سے ہندی لیکن اپنے ذوق اور افکار و اخلاق کے لحاظ سے انگریز ہوں۔ ملک کی دیسی زبانوں کی تہذیب و ترقی کا کام بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے کہ مغربی لغات سے علمی اصطلاحات لے لیکر اپنی دیسی زبانوں کو مالا مال کریں اور بتدریج اس قابل بنادیں کہ انھیں کے ذریعے عوام تک علوم کو پہنچایا جاسکے۔

قدیم طریق تعلیم سے جن لوگوں کی مالی اغراض وابستہ ہیں میں اُن کے حقوق کا پوری طرح لحاظ رکھنا چاہتا ہوں اور ان سب کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک کرنے کا خواہاں ہوں جو معقول وجوہ کی بنا پر سرکار سے اپنی کفالت کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی میں اُس ناقص نظام کی بالکل بیخ کنی کر دینی چاہتا ہوں جسے اب تک ہم نے قائم اور سرسبز رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بلاتاخیّر عربی اور سنسکرت کتب کا چھاپنا موقوف اور کلکتہ کا مدرسہ اور سنسکرت کالج بند کر دیئے جائیں۔ برہمنی تعلیم کا بڑا مرکز بنارس اور علوم عربیہ کا صدر مقام دہلی ہے۔ لہذا اگر ہم بنارس کے سنسکرت کالج اور دہلی کے اسلامی کالج کو بحال خود قائم رکھیں تو پھر یہ نزدیک یہ مشرقی السنہ کی کافی بلکہ کافی سے زیادہ رعایت ہے اور ان دونوں کالجوں کو جاری رکھنے کی

صورت میں بھی میری تجویز یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو سرکاری وظیفہ دینا بند کر دیا جائے اور لوگوں کو ایسی تعلیم کے لئے جس کے وہ خواہاں نہیں۔ سرکاری طرف سے کوئی رشوت نہ دی جائے اب یہ اُن کی مرضی کہ قدیم یا جدید علوم کی تعلیم میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔ اس طرح جو سرمایہ ہمارے پاس بچ گیا وہ کلکتہ کے ہندو کالج (انگریزی) کو پہلے سے زیادہ امداد دینے میں اور صوبہ بنگالہ و اگرہ کے تمام بڑے بڑے مقاصد پر ایسے مدارس قائم کرنے میں کام لے گا جن میں انگریزی زبان کی عمدہ طریق پر تعلیم دی جائے۔

اب اگر گورنر جنرل باجلاس کونسل اس معاملہ میں وہی فیصلہ کریں جس کی مجھے امید ہے تو میں مجلس تعلیمات کی صدارت کے فرائض نہایت خوشی اور مستعدی کے ساتھ انجام دینے میں مشغول ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر سرکار کی رے یہ قرار پائے کہ موجودہ طریق تعلیم بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہے تو میری درخواست ہے کہ مجھے مجلس تعلیمات کی صدارت سے مستعفی ہونے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ کیوں کہ اس صورت میں میرا اس عہدے پر رہنا بالکل بے سود ہوگا بلکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں ایک ایسے کام میں معاون رہوں جو میرا ختمہ تعین ہے کہ محض دھوکا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ طریق تعلیم حق و صداقت کی اشاعت میں کوئی تقویت نہیں پہنچاتا بلکہ اُلٹا اُدھام باطلہ کو جو اپنی قدرتی موت مر رہی ہیں اُمرنے سے روکتا ہے۔ بحالتِ موجودہ میں خیال کرتا ہوں کہ ہمیں مجلس تعلیمات عامہ کا معزز لقب اختیار کرنے کا بھی استحقاق نہیں۔ ہماری مجلس تو محض لوگوں کا روپیہ ضائع کرنے اور ایسی کتابیں چھاپنے کے لئے ہے جو اتنی قیمت بھی نہیں رکھتیں جتنی کہ چھپنے سے پہلے اُن کا (سادہ) کاغذ کھتا اُدھ (یعنی مجلس) مہل تاریخ، مہل طبوعات و مہل با بعد الطبیعات کی زبردستی ترویج میں کوٹتا ہے اور ایسے فاضلوں کی اُمت تیار کر رہی ہے جن کے حق میں تعلیم ایک مصیبت اور فحشیت ہے جو طالب علمی کے زمانہ میں تو سرکاری خرچ سے پلتے ہیں اور پھر اُن کی تعلیم اس قدر کم ہوتی ہے کہ اس کی تحصیل کے بعد یا تو سرکار ہی ساری عمر اُن کی پرورش کری اور یا وہ بھوکے رہ جائیں۔

جب کہ میرے خیالات یہ ہیں تو پھر قدرتی بات ہے کہ میں ایسی جماعت میں شریک ہونا پسند نہیں کر سکتا جو اپنے سارے طرز عمل کو بدلے بغیر میرے نزدیک نہ صرف بیگناہ بلکہ یقیناً نقصان رساں ہے۔

تلیحات

از

جناب لوی سید وحید الدین صاحب سلیم
پروفیسر اردو عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن

(جولائی نمبر آگے)

ادبی تلیحاتِ قسم اول میں جو تلیحاتِ ربع کی گئی ہیں، وہ بطور مثال کے ہیں۔ تمام تلیحات کا استیعاب نہیں کیا گیا۔ یہ کام اُس مصنف کا ہے، جو تلیحات کی فہرست مرتب کرے۔ اب ہم اُن تلیحات پر توجہ کی نظر ڈالتے ہیں، جو قسم دوم میں داخل ہیں اور یہ وہ تلیحات ہیں، جن میں ایرانی اثر پایا جاتا ہے۔

اردو ادبی تلیحات
(قسم دوم)

جمشید ایران کا ایک مشہور پادشاہ تھا، جو عیش و عشرت اور شان و شوکت کے لحاظ سے بار بار مذکور ہوا ہے۔ اُس کو جم بھی کہتے ہیں۔ مگر جم کے لفظ سے شعر اکبری حضرت سلیمان مراد لیتے ہیں، کبھی سکندر اور کبھی ایران کے اس نامور پادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خاتمِ جم۔ نگینِ جم۔ انگشترِ جم۔ تختِ جم کی تلمیحوں میں اس لفظ سے حضرت سلیمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آئینہِ جم میں سکندر مراد ہے۔ بزمِ جم۔ جامِ جم۔ جہنِ جم۔ ساغرِ جم میں ایران کے بادشاہ جمشید کی طرف اشارہ ہے۔ ان تلیحات میں جم کی جگہ جمشید کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کے پاس شراب ہمارے گلاب تھا۔ اس کے گرد مات خطا کھینچے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے خط یعنی بالائی خط تک شراب بھری جاتی ساتوں منزلیں،

کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس پیالہ کو پی سکے۔ پہلے خط یعنی کنارے کے خط کا نام خطِ جوہری۔ باقی چھ خطوط کے نام ترتیب وار حسب ذیل ہیں۔ خطِ بغداد۔ خطِ بصرہ۔ خطِ ارزق جس کو خطِ سیاہ۔ خطِ شب اور خطِ سبز بھی کہتے ہیں۔ خطِ شکر یا خطِ اشک۔ خطِ کاسہ گر۔ خطِ فردینہ۔ تختِ جمشید جو ایران کے آثارِ قدیمہ میں سے ایک عالی شان عمارت ہے اسی بادشاہ کی یاد گار ہے۔

ایک اور بادشاہ جس نے ایران پر حکومت کی، ضحاک تھا۔ یہ اپنے ظلم و ستم اور خوں ریزی کے سبب بدنام ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے دونوں شانوں پر دو سانپ پیدا ہو گئے تھے۔ اُن کی غذا کے لئے انسان کا گوشت درکار تھا۔ ضحاک ہر روز انسانوں کو ہلاک کرتا اور ان سانپوں کے لئے خوراک بہم پہنچاتا تھا۔ مار ضحاک سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ بادشاہ فریدوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

فریدوں اپنی عظمت و صولت کے سبب مشہور ہے۔ جب شاہِ کسی بادشاہ کی تعریف کرتے ہیں، تو اُس کو فریدوں فرما کر کہتے ہیں۔ ضحاک کے عہد حکومت میں ایک لہار تھا، جس کا نام کاوہ تھا۔ یہ لہار آسمان کا باشندہ تھا اس کے چار بچے ضحاک نے مروا ڈالے تھے۔ خلعتِ ضحاک کے جوہر و ستم سے عاجز آگئی تھی۔ کاوہ کے دل میں ان واقعات کو دیکھ کر جوش پیدا ہوا۔ اُس نے دکان بند کر دی۔ جس چڑے کو وہ اہرن کے نیچے بچھایا کرتا تھا، اُس کو ایک لکڑی پر آویزاں کر کے پھریرا بنایا اور ڈھول بجاتا، ضحاک کے ظلم کے راگ گاتا نکل کھڑا ہوا۔ اس جھنڈے کو درفش کاویانی کہتے ہیں۔ ظلم کا ویانی۔ پرچم کا ویانی۔ اختر کا ویانی کے الفاظ سے بھی یہی جھنڈا مراد ہے۔ ایران کے باشندے جو ضحاک کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے تھے، اس جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ کاوہ اس لشکر کو اپنے ساتھ لے کر بڑھا۔ ضحاک کی فوجوں سے اُس کی ٹکر ہوئی۔ ان فوجوں نے شکست کھائی۔ یہاں تک کہ تمام ایران کو کاوہ نے فتح کر لیا۔ اُس نے بذاتِ خود سلطنت کرنے سے انکار کیا۔ فریدوں جو جمشید کا بیٹا تھا اور جس کا باپ ضحاک کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا تختِ ایران پر بٹھایا گیا۔ تمام لڑائیوں میں درفش کاویانی فوج کے آگے رہتا تھا۔ بے دریغ فتوحات نے یہ بات ذہن نشین کر دی کہ یہ جھنڈا بہت مبارک ہے۔ کاوہ کے مرنے کے بعد فریدوں نے اور فریدوں کے بعد اُس کا ادشاہوں نے اس جھنڈے کو جواہرات سے مرصع کیا۔ یزدجرد کے زمانے تک یہ جھنڈا ہر لڑائی کے چلتا تھا۔ حضرت عمر کے زمانے میں یہ جھنڈا مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اُس کے جواہرات تقسیم

کردیئے گئے اور چمڑا جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔

کیخسرو ایران کا ایک اوزموفزاں رواتھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ایک پیالہ بنایا تھا۔ اُس پر ہندی خطوط کچے ہوئے تھے۔ جس طرح اصطرلاب کے خطوط سے تاروں کا ارتفاع وغیرہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح اس جام کے خطوط سے تاروں کی گردش نمایاں ہوتی تھی اور زلزلے کے آئندہ واقعات اس سے معلوم کیے جاتے تھے۔ اس جام کی طرف جو اشارے ہمارے شعرا نے کیے ہیں، اُن کے لئے حسبِ ذیل الفاظ تراشے گئے ہیں :-

جامِ کیخسرو۔ جامِ جہاں نما۔ جامِ جہاں ہیں۔

کیانیوں کے عہدِ حکومت میں ایران اور توران کے درمیان ہمیشہ معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ ایرانیوں کی حمایت میں سیستان یا زابلستان کے ایک پہلوان نے اپنے شانِ ارکار ناموں سے بڑی شہرت حاصل کی اس پہلوان کا نام رستم تھا۔ رستم کو پستین اور تہمتن بھی کہتے ہیں۔ یہ زال کا بیٹا تھا، اس لئے پور زال کے لفظ سے بھی یہی پہلوان مراد ہے۔ شاہِ نامہ فردوسی کا ہیرو یہی رستم ہے۔ رستم کے ہاتھ میں گرز رہتا تھا، جو گرز رستم کے نام سے مشہور ہے۔ چوں کہ یہ گرز بیل کے سر سے مشابہ تھا، اس لئے اسے گرز گاؤس بھی کہتے ہیں۔ اُس کے گھوڑے کا نام رخس ہے۔ سہراب اسی کے بیٹے کا نام تھا۔ اتفاق سے دونوں باہم جنگ آزما ہوئے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ جب رستم کے ہاتھ سے سہراب زخمی ہو چکا، تو اس اُسے آگاہ ہوا۔ مگر واقعہ لاعلاج تھا۔ افزاسیاب جو توران کا بادشاہ تھا اس کے لشکر سے بار بار رستم کے مقابلے ہوئے۔ کیکاؤس جو ایران کا نہایت مشہور بادشاہ تھا، اُسے ایک دفعہ دیووں نے گرفتار کر کے مازندران کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ رستم اس بادشاہ کو قید سے چھڑانے کے لئے گیا۔ رستم نہایت دشوار گزار تھا۔ ہر منزل میں ایک نئی ہولناک مصیبت و تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ سات منزلیں شاہِ نامہ کی زبان میں ہفتخوآں کے نام سے مشہور ہیں۔ ہفتخوآں کو طے کر کے رستم کیکاؤس کو دیووں کی قید سے چھڑا لایا۔ شاہِ نامہ میں ہفتخوآن رستم کے علاوہ ایک اور ہفتخوآن بھی ہے جو ہفتخوآن اسفندیار کے نام سے موسوم ہے۔ ارجاسپ بادشاہ اسفندیار کی دو بہنوں کو پکڑ کر لے گیا تھا اور انہیں دینِ دژ میں جو ایک قلعہ کا نام ہے۔ قید کر دیا تھا، جب اسفندیار اپنی بہنوں کو چھڑانے کے لئے اُس قلعہ کی طرف روانہ ہوا، تو رستم میں اُسے بھی سات مصیبت خیز اور ہولناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسفندیار کی بھی ساتوں منزلیں

جن کو طے کرنے کے بعد وہ اپنی بہنوں کو چھڑا کر لایا، ہفتخان اسفندیار کے نام سے مشہور ہیں۔ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ رستم کے باپ کا نام زال تھا۔ زال کو دستان بھی کہتے ہیں، اس لحاظ سے رستم کو رستم دستان کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ زال کی پردریش پہاڑ کے ایک غار میں سیمرغ نے کی تھی۔ جوان ہونے پر سیمرغ نے اپنا ایک پر اسے دیدیا تھا کہ جب میرے بلانے کی ضرورت ہو، اس پر کو آگ پر کھنا میں اُس کی بو پر آہنچو گا۔ رستم کو جب کبھی کوئی سخت واقعہ پیش آیا، اسی پر کی مدد سے سیمرغ بلایا گیا اور اُس سے مشورہ کیا گیا۔ سام رستم کے دادا کا نام تھا اور نرمایاں پر دادا کا۔ شغاد رستم کا ایک بھائی تھا، جو اُس کی طرف سے دل میں حسد رکھتا تھا۔ اُس نے سات کنوئیں تھوٹے تھوٹے فاصلے پر تیار کر ائے اور اُن کو ہتھیاروں سے بھر دیا اور خن پوش کر دیا۔ پھر رستم کو سیر و شکار کے بہانے سے اُس موقع پر لے گیا، جہاں وہ خن پوش کنوئیں تھے۔ رستم جو گھوٹے پر سوار تھا، پہلے کنوئیں میں گر گیا۔ مگر گھوڑے نے جبت کی، تو اُس میں سے نکل آیا؛ پھر دوسرے کنوئیں میں جاگرا۔ جب چھ کنوؤں سے جبت کر کر نکل چکا اور ساتویں کنوئیں میں گرا، تو رستم اور اُس کا گھوڑا دونوں بہت زخمی ہو گئے تھے۔ آخر رستم نے اسی کنوئیر میں جان دی۔ شعر اس واقعہ کی طرف چاہ رستم کے لفظ سے اشارہ کرتے ہیں۔

چاہ رستم کی طرح ایک تلیج چاہ بیزن بھی ہے۔ بیزن کیو کا بیٹا اور رستم کا؛ مانجا تھا۔ وہ افزایا ب کی بیٹی منیرہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس کی پاداش میں وہ ایک چاہ و تاریک کے اندر قید کر دیا گیا۔ یہی کنواں چاہ بیزن کہلاتا ہے۔ رستم اُس کو آخر کار قید سے چھڑا لایا۔

سیادش کی کاؤس کا بیٹا تھا۔ اپنی سوتیلی ماں کے طعنوں سے تنگ آکر اپنے باپ کے دشمن افزایا ب کے پاس چلا گیا، جو توران کا بادشاہ تھا۔ وہ پہلے تو اُس کے آنے سے بہت خوش ہوا اور اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی؛ مگر پھر اپنے ایک اور داماد کے بہکانے کھانے سے لے ناحق قتل کر ڈالا۔ خون سیادش اسی واقعہ کی تلیج ہے۔ اس لفظ سے خون ناحق مراد لیتے ہیں۔

ہرام گور بھی ایران کا ایک مشہور بادشاہ تھا، جو شہسوار ی اور نیزہ بازی میں شہرت رکھتا تھا۔ یشکا کابے حد شائق تھا اور اکثر گور شکار کرتا تھا۔ اسی لحاظ سے اُسے ہرام گور کا لقب دیا گیا ہے، ہمارے شعر اس بادشاہ کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔

نوشیرواں ایران کا عادل بادشاہ مشہور ہے۔ اُس کا محل ایوانِ کسریٰ کے نام سے موسوم ہے، جو نہایت عالی تھا۔ اسی کو طاقِ کسریٰ بھی کہتے ہیں۔ ان تلیمات میں کسریٰ کو نوشیرواں کا مرادف خیال کیجئے۔ جب یہ محل بننے لگا، تو محل کے ایک پہلو پر ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ چاہا کہ اس جھونپڑی کی جگہ خرید لی جائے، تاکہ محل اس گوشے کی طرف تیز تر ہانہ رہ جائے، مگر بڑھیا نے جگہ دینے سے انکار کیا۔ عاملانِ شاہی نے بڑھیا پر جبر کرنا چاہا، مگر نوشیرواں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ میں ظلم سے رعایا کی زمین پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میرا محل تیز تر ہار ہے، تو کچھ پردا نہیں۔ عدلِ نوشیروانی کا ذکر جب ہمارے شعر اُکرتے ہیں، تو اس بڑھیا کا ذکر ضرور آتا ہے۔

نوشیرواں کا بیٹا ہرمز تھا۔ ہرمز کا بیٹا پردیز، جس کو خسرو پردیز بھی کہتے ہیں۔ اس بادشاہ ذکر ہمارے شعرا نے بار بار کیا ہے۔ یہ مقابلہ دیگر شاہانِ ایران کے زیادہ مالدار تھا۔ اس کے پاس آٹھ خزانے تھے، جن کے نام حسبِ ذیل ہیں:-

گنجِ عروس۔ گنجِ باد اور دیا گنجِ شایگان۔ گنجِ دیبا خسروی۔ گنجِ افراسیاب۔ گنجِ سوختہ۔ گنجِ خضرا۔ گنجِ شاد اور د۔ گنجِ بار۔

اس بادشاہ کے گھوڑے کا نام شبِ یز تھا، جو ایک علی دے کے مشکلی گھوڑا تھا۔ کچھ دنوں تو اس بادشاہ نے عاقلانہ اور مدبرانہ طریقہ سے سلطنت کی، مگر آخر میں وہ عیش پسند ہو گیا۔ اس نے اپنے محل میں حسین عورتیں کثرت سے جمع کر لیں۔ اسی زمانہ عیش میں اُس نے شیریں کے حسن کا چرچا سنا۔ یہ آرمین کی ملکہ مہین بانو کی بیٹی تھی۔ خسرو نے اپنے ایک مصاحبِ پورامی سے اس باب میں امداد چاہی۔ شاہ پور کو منصور ی میں کمال تھا۔ اُس نے خسرو کی کئی تصویریں مختلف لباس اور مختلف وضع کی کھینچیں پھر ان تصویروں کو نعل میں با آرمین پہنچا۔ ایک بلغم میں، جس میں شیریں سیر تعریج کے لیے آیا کرتی تھی۔ اُس نے دو تصویریں درختوں سے لٹکادیں۔ شیریں کی نظر اُن پر پڑی، تو وہ فریفتہ ہو گئی۔ اُس نے شاہ پور کو بھی دیکھا اور اُس سے ان تصویروں کا حال پوچھا۔ اُس نے خسرو کے حسنِ جمال کا تذکرہ اس طرح تک مچ لگا کر کیا کہ وہ خسرو کے پاس جانے اور اُس سے شادی کرنے پر رضی ہو گئی۔ آخر کار شیریں خسرو کے محل میں داخل ہوئی۔ خسرو محل کی تمام حسین عورتوں سے زیادہ اُسی سے محبت

کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیریں کو تازہ دودھ سے بہت رغبت تھی۔ شہر کے کنائے ایک پہاڑ کو ہستیوں نامی کھڑا تھا اس کی پشت پر بکریوں کے گلے چرتے تھے۔ انہیں کا دودھ شیریں کے محل میں لایا جاتا تھا، مگر اتنی دُور سے لانے میں وقت تھی۔ ایک نامی سنگ تراش فرہاد سے کہا گیا کہ وہ کوہ مذکور سے ایک نہر کاٹ کر شیریں کے محل تک پہنچا لے تاکہ چراگاہ سے بکریوں کا دودھ وہ نہر میں ڈال جائے اور وہ بہہ کر شیریں کے محل میں پہنچے۔ فرہاد مذکور بھی اتفاقاً سے شیریں پر ذوق تھا۔ اس کے عشق کے چرچے پھیل چکے تھے۔ خسرو نے اس خیال سے کہ اُس سے بھیجا جائے یہ خدمت اُس کے سپرد کی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اس خدمت کو سرانجام دے سکا، تو شیریں اُس کو بخش دینی گئی۔ خسرو کو یقین تھا کہ فرہاد اس سنگین خدمت کو انجام تک نہ پہنچا سکیگا، مگر عشق اور اُمید وصال محبوب نے فرہاد میں ہزاروں سنگ تراشوں کی قوت پیدا کر دی۔ وہ کمر باندھ کر اس کام میں مشغول ہو گیا۔ بیستون کے پتھر کاٹنے کے وقت فرہاد عشق کی دُھن میں جا بجا شیریں کے مورتیں تراشتا جاتا تھا۔ کئی سال کے بعد جب یہ کام اختتام کے قریب پہنچا اور ایفاء وعدہ کا وقت آیا، تو خسرو نے ایک مکار بڑھیا کو فرہاد کے پاس بھیجا، جو سر کے بال بکھرے ہوئے روتی پٹیتی اُس کے پاس پہنچی اور اُس نے یہ جھوٹی خبر سنائی کہ شیریں کا انتقال ہو گیا۔ فرہاد کو جو صدمہ اس خبر سے ہوا، وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اُس کے ہاتھ میں تیشہ تھا۔ وہی تیشہ اپنے سر پر مارا اور ہلاک ہو گیا۔ شیریں اور فرہاد کا افسانہ ایران میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس قصے پر مثنویاں لکھی گئیں۔ شاعران نے لیلیٰ اور مجنوں کی طرح ان دو عاشق و مشوق کے تذکرہ کو بھی اپنے اشعار میں عاشقانہ لہجے کا محور بنالیا ہے۔ فرہاد کا لقب کوہکن ہے۔ جوئے شیر وہ نہری، جو فرہاد نے بیستون سے کاٹ کر قصر شیریں تک پہنچائی۔ قصر شیریں کی جگہ قصر خسرو کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ بابر اس بادشاہ کا خاص رباری بربط نواز تھا، جو موسیقی کے فن میں کمال رکھتا تھا۔ اس نے تیس اگیناں ایجاد کیں جو تسی لحن کے نام سے مشہور ہیں۔ ترانہ باربد یا ترانہ باربدی سے اسی بربط نواز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ خسرو پر دیز کے تخت کا نام طاقدیس تھا۔ تخت فریدون سے اُس کے ورثہ میں آیا تھا۔ اس کا طول (۱۷۰) گز اور عرض (۱۲۰) گز تھا۔ سر سے پاؤں تک بچہ اہل نصب کئے گئے تھے۔ اُس کی چھتری میں بارہ برجوں اور سات ستاروں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا تھا کہ فلکی اور نجومی حالات اس سے معلوم ہوتے بہتے تھے۔

مانی اور بہراد و نقاشوں کے نام بار بار شاعری میں لائے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا ایک دمی نقاش تھا۔ اُس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔ مانوی فرقہ اُسی کی طرف منسوب ہے۔ اُس نے تصویروں کا جو مجموعہ تیار کیا تھا، اُس کو آرتنگ یا ارتنگ کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارتنگ ایک دوسرے مصور کا نام تھا۔ بہراد شاہ سمیع صفوی کے زمانے کا نقاش ہے۔ مرقع مانی۔ نقش بہراد کے الفاظ انہیں دونوں نقاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آتش پرستوں یعنی زرتشتیوں کے مذہب سے جو ملمحیں لی گئی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں :-
 اہرمن اور یزدان دو قوتوں کا نام ہے جو دنیا پر حکمرانی کرتی ہیں۔ کبھی یہ قوت غالب آتی ہے اور کبھی وہ۔ ان میں سے پہلی قوت بدی کی ہے۔ دوسری قوت نیکی کی۔ سدہ آگ کو کہتے ہیں۔ جمشید نے اول اول پتھر سے آگ نکلتی دیکھی، تو اس خوشی میں ایک جشن کی بنیاد ڈالی۔ یہ جشن سدہ کے نام سے مشہور ہے۔ زرتشتی مذہب والے آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ آتش کدوں میں آگ ہر وقت روشن رہتی ہے۔ کبھی بجھنے نہیں پاتی۔ آتش فارسی اسی آگ کی طرف اشارہ ہے۔ آتش کدہ کی خدمت کے لیے جو خوبصورت نوجوان مقرر ہوتے تھے۔ وہ منع کھلاتے تھے اور ان کا افسر پر مغال کہلاتا تھا۔ یہی نوجوان مجلسوں میں ساتی گری کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آتش کدوں میں ایک جانور چھپکی کی شکل کا پیدا ہو جاتا ہے، جس کی زندگی کا مدار آگ کھانے پر ہے۔ اس کو سمندر کہتے ہیں۔ سمندر کا ذکر بھی ہماری شاعری میں بار بار آتا ہے۔ جب آفتاب برج حمل کے پہلے نقطے پر پہنچتا ہے اور جب کہ ماہ فردردیس کا پہلا دن ہوتا ہے، پارسی خوشیاں مناتے ہیں۔ اس روز کو نوروز کہتے ہیں۔

نخشب ترکستان کا ایک شہر ہے جو سمرقند سے تین دن کے رستے پر ہے۔ یہاں ایک حکیم ابن عطانامی نے جسے ابن مقفع بھی کہتے ہیں، کسی عجیب طریقے سے ایک مصنوعی چاند بنایا تھا، جو نخشب کے ایک کنوئیں سے ہر روز شام کے وقت برآمد ہوتا تھا اور آنا بند ہوتا تھا کہ اُس کی روشنی چاروں طرف بارہ میل تک پہنچتی تھی۔ دو مہینے تک یہ چاند برابر نکلتا رہا۔ اس چاند کو ماہ نخشب اور ماہ مقفع کہتے ہیں اور اس کوئیں کو جس میں سے وہ چاند نکلتا تھا، چاند نخشب کہتے ہیں۔ ایک اور ملیح سنگ یدہ ہے۔ ترکستان میں ایک مقدس پتھر تھا۔ جب بارش کا اساک ہوتا تھا

ترکستان کے لوگ جنگل میں نکل جاتے اور اُس پتھر کو ہاتھ پر رکھ کر بارشس کی دعا مانگتے تھے۔ اُس کی برکت سے بارشس ہونے لگتی تھی۔ اِس پتھر کو سنگِ یدہ کہتے ہیں۔ کمانِ رستم جب ہماری شاعری میں آتا ہے تو اس سے قوسِ قزح مراد لی جاتی ہے۔ لسانِ الغیب حافظ شیراز کا، بئیل آمل طالبِ ملی کا، بئیل شیراز سعدی شیرازی کا، حسانِ عجم اور خلاقِ المعانی خاقانی شروانی کا اور عندلیبِ نیشاپور نظیری نیشاپوری کا لقب ہے۔ شاخِ نباتِ حافظ شیراز کی محبوبہ کا نام ہے۔ آیا ز سلطان محمود غزنوی کا ایک عزیز و محبوب غلام تھا۔ حُسن و عشق کے ذکر میں یہ دونوں نام بھی لئے جاتے ہیں۔ سکندر نے ایران کو فتح کیا تھا۔ شاعروں نے اُس کی فتوحات کو آبِ و تاب سے بیان کیا۔ اُس کے عجیب و غریب کارنامے لکھے گئے۔ اُس کی تعریف کے گیت یہاں تک گائے گئے کہ لوگوں نے اُس کو پیغمبر بھی سمجھ لیا۔ آبِ حیات کے چشمے کی طرف اُس کے جانے کا ذکر خضر کی تبلیغ میں مذکور ہوا ہے۔ سکندری کا ذکر ذوالقرنین کی تبلیغ میں کیا گیا ہے۔ ایک اور تبلیغ سکندر کی نسبت یہ ہے کہ اُس نے حکیم بنیاس کی ہدایت سے اسکندریہ میں ایک عظیم آستانِ مبارک بنوایا تھا، جو تین سو گز بلند تھا۔ اُس پر ایک آئینہ لکایا تھا، جس کا دور اکیس گز کا اور قطرات گز کا تھا۔ یہ آئینہ دُور بین کا کام دیتا تھا۔ جب اُس میں سے دیکھتے تھے، تو سفسطینہ کا سارا شہر انگوٹوں کے سامنے نظر آتا تھا۔ آئینہ سکندر سے اسی بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ادبی تبلیغات کے بعد اب ہم ذیل میں عام تبلیغات پر نظر ڈالتے ہیں:-

عام تبلیغات | عام بول چال میں جو تبلیغات مستعمل ہیں، اُن میں سے بعض تاریخ سے لی گئی ہیں، بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملحد مذہبی عقائد و ادھام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔ بعض ان دونوں قوموں کی خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اور بعض کی بنیاد اُن فرضی قصوں پر ہے، جو عام طور سے مشہور ہیں ان میں سے بعض تبلیغیں محاوروں کی شکل میں ہیں اور بعض مشلوں کے پیرایے ہیں۔ ایسے محاوروں کو ہم تبلیغی محاورے اور ایسی مثالوں کو ہم تبلیغی مثلیں کہتے ہیں۔ ماخذوں کے لحاظ سے یہ تبلیغیں ملی جلی ہیں۔ ہندو مسلمان ان میں بیک وقت شریک ہیں۔

مندرجہ بالا چاروں قسم کے تبلیغات کی مثالیں ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:-

(اَوَّل) وہ تمہیں جو تاریخ سے لی گئی ہیں۔

دھائی دن کی پادشاہت یا اڑھائی دن کی پادشاہت سے تھوڑے دنوں کی حکومت یا ناپائیدار حکومت
 فراہمی۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس واقعہ سے آگاہ ہیں کہ جب ہمایوں شیرشاہ سے شکست کھا کر
 دریا میں کود پڑا، تو نظام ستے نے اُس کو ڈوبتے ڈوبتے بچایا تھا اور اُس کے صلے میں اُس نے ہمایوں پادشاہ
 سے دھائی دن کی حکومت مانگی تھی۔ نظام نے اس قلیل دور حکومت میں چڑے کا گول روپیہ سونے کی کیل جڑ کر
 چلایا تھا۔ اس واقعہ سے ایک دوسری تلخ پیداموئی ہے۔ چام کے دام چلانا۔ اس محاورہ سے جوتے کے زور سے
 حکومت کرنا اور جبراً کام لینا فراہمی۔ اورنگ زیبی ایک طبی تلخ ہے۔ یہ ایک سوداوی مادہ کا پھوڑا ہے، جو اکثر نئی
 سال تک ہر اہر تباہی اور اچھا ہونے میں نہیں آتا۔ جب درنگ زیب علم گیر نے گول کنڈہ کا محاصرہ کیا اور محاصرہ
 نے وہ طول کھینچا، تو آب و ہوا کی خرابی سے اکثر اہل شکر کے پھوڑے نکل آئے اور باوجود علاج کے وہ مدت تک ہر
 رہے۔ اسی پھوڑے کو اورنگ زیبی کہتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں پادشاہوں کے جلوس کے ساتھ بائیں اٹلی
 کی فوج رہتی تھی۔ یہ فوج بائیںی کہلاتی تھی۔ بائیںی ٹوٹے کا محاورہ اسی سے نکالا گیا ہے، جس سے فراہمی ساری فوج سے
 حملہ کرنا، یا تمام زور صرف کر ڈالنا۔ ٹوپی والے وہ قزلباش سپاہی کہلاتے ہیں جو اول نادر شاہ کے ساتھ،
 پھر احمد شاہ ابدالی کے ساتھ آئے تھے۔ ترکی زبان میں قزل کے معنی سرخ اور باش کے معنی ہیں ستریا سپاہی سڑوں
 پر لال لال ٹوپیاں رکھتے تھے۔ اسی سبب قزلباش کہلاتے تھے۔ دلی والوں نے ان کا نام ٹوپی والے رکھا۔ ایک
 زلے میں دلی میں افغان پادشاہوں کی حکومت تھی۔ اُس زمانے کی یادگار پٹھانوں کی وہ چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں جو
 پاس پاس بنائی گئی ہیں۔ پٹھان تند مزاجی کے سبب کسی کا احسان اپنے سر لینا اور غیر کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا
 گوارا نہیں کرتے تھے۔ ڈیرہ اینٹ کی مسجد بنانا ایک تلخی محاورہ ہے، جو اس واقعہ کو یاد دلاتا ہے۔ رادھا کو یاد کرو
 ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ سری کرشن کی ایک محبوبہ کا نام رادھا اور ایک کا کچا تھا۔ کچا
 بے تکلفی اور شوخی سے یہ کلمہ زبان پر لایا کرتی تھی۔ کالے کلوٹے آدمیوں کو محاورہ میں اُون کی تینا کہتے ہیں۔ اُون
 جو لٹکا کا راجہ تھا اور جو رام چند رجبی کے ساتھ نبرد آزما ہوا، اُس کی فوج کے لوگ سیاہ فام تھے، یا اُن کی
 دریاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ اسی سبب رام کیلا میں جو اس واقعہ کی نقل ہے، رادون کی فوج کے سپاہیوں کو

پاہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ رستم محاورہ میں بہادر کے معنوں میں بولا جاتا ہے، جیسے بس ایک تم ہی تو رستم ہو۔ یہاں تمہاری رستی کیوں نہ چلی۔ رستم کا بچہ، رستم خاں اور رستم کا سالاد غیرہ الفاظ بھی بولے جاتے ہیں۔ چھپا رستم ایک اور محاورہ ہے، جس کے دو معنی لے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ شہر یا آدمی جو ظاہر میں غریب نظر آتا ہو۔ دوسرے وہ شخص جو کامل الفن ہو اور وقت پر اس کا ہنر ظاہر ہو۔ افلاطون جو یونان کا مشہور حکیم ہی کشتی کے فن میں کامل تھا۔ اس بنا پر جہاں زور آور اور زبردست کے معنوں میں رستم کا لفظ بولا جاتا ہے، وہیں افلاطون اور افلاطون کا بچہ وغیرہ الفاظ بھی رائج ہیں۔ سکھنا شہی کے لفظ سے بے انصافی اور کس پر سی کا زمانہ مراد لیتے ہیں۔ یہ تبلیغ سکھوں کے عہد حکومت کو یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح نادر شاہی یا نادر گردی سے بد انتظامی اور افتخاری کا زمانہ مراد لیتے ہیں۔ یہ الفاظ نادر شاہ کے زمانے میں اس ملک کی حالت کا پتہ دیتے ہیں۔ تانا شاہی مزاج کا لفظ اس نازک مزاجی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ابوالحسن تانا شاہ والی گول کنڈہ میں تھی۔ تخت طاؤس شاہ جہاں کے تخت کی تبلیغ ہے، جس پر چھ کرور روپیہ صرف ہوا تھا اور جو جواہرات سے مرقع تھا اور جس کے اوپر ایک مور نکھ پھیلائے کھڑا تھا۔ انخش ایک مشہور مصرنی تھا۔ اس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ عربی افعال کی گردائیں اس بکری کے سامنے دھرا کرتا تھا۔ اگر وہ بکری سر ہلا دیتی، تو سمجھتا تھا کہ سبق یاد ہو گیا، ورنہ پھر اس سبق کو رٹنا شروع کر دیتا تھا۔ جس وقت اس بکری کو ذبح کیا، تو معلوم ہوا کہ اس کے سر میں بھیجا نادر ہے۔ اس سبب ایسے آدمی کو جو بے سمجھے گردن ہلا دے، بڑا انخش کہتے ہیں۔ لکھ انخش یا لکھ دانا اس شخص کو کہتے ہیں، جو انتہا دے کا فیاض ہو۔ یہ اصل میں قطب الدین ایبک کا لقب ہے، جو شہاب الدین غوری کا ظلام تھا اور اس کے مرنے پر خود پادشاہ ہو گیا تھا۔ اس کی فیاضی کی داستان آج تک زبان زد عام ہیں۔ ہندو کج تک اسے پوجتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جا بجا تھان بنا کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ہلا کو ظالم اور سفاک آدمی کو کہتے ہیں۔ یہ تبلیغ ہولا کو خاں کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو چنگیز خاں کا پوتا تھا اور اسی نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا۔ تورہ والی مفرد عورت کو کہتے ہیں۔ تورہ جانا شیخی کرنا ہے۔ شرع تورہ بھی محاورہ ہے، جس سے دین داری کا اظہار اور بات بات میں مذہبی روک ٹوک مراد ہے۔ تورہ اصل میں خلیجی خاں کے مجموعہ قوانین کا نام تھا، جس میں ہر قانون کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ یہ سب محاورے اسی لفظ تورہ سے لے گئے ہیں۔ گھر کا بھیدی لکھا دھاوے یہ ایک قلمی مثل ہے۔ راون کے بھائی بھوشن نے راجہ ام چند

بل کر ان کو قلعہ لنگا کے ہسٹک بھید بتائے تے اور اُس کے فتح کرنے میں مدد دی تھی۔ اب اس نسل سے مطلب یہ ہے کہ رازدار کی دشمنی بڑا نقصان پہنچاتی ہے۔

(دوم) وہ شخص جو عام عقائد وادہام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔

جب کوئی شخص سفر کو سدھارتا ہے، تو مسافر کے بازو پر روپیہ وغیرہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جب وہ خیر و عافیت سے منزل مقصود پہنچ جاتا ہے، تو وہ رقم سیدوں کو بانٹ دی جاتی ہے۔ اس کو امام ضامن کا روپیہ کہتے ہیں۔ یہاں امام سے حضرت علی رضا آٹھویں امام مراد ہیں۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر آپ کے نام کا روپیہ مسافر کے بازو پر باندھ دیا جائے، تو آپ اُس کی سلامتی کے ضامن ہو جاتے ہیں۔ اندر کا اکھاڑا اُس مقام کو کہتے ہیں، جہاں ناچنے گانے والی حسین عورتیں جمع ہوں۔ ہندو راجہ اندر کو سواگ پتی یعنی بہشت کا مالک مانتے ہیں، جس کے سامنے خوریں گاتی اور ناچتی رہتی ہیں۔ یہ محاورہ اسی خیال پر مبنی ہے۔ بجلی کی تلوار اُس تلوار کو کہتے ہیں جو بت کاٹ کرنے والی ہو۔ عوام کا خیال ہے کہ بعض مقامات میں بجلی اکثر گر اگتی ہے۔ وہاں کے ہمار بہت سالو با جمع کر کے میدان میں لکھ دیتے ہیں، تاکہ اُس پر بجلی گرے اور وہ آبدار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ جو تلوار اس لوہے سے بنائی جاتی ہے، اُس کا مقابلہ آب اری اور کاٹ میں کوئی تلوار نہیں کر سکتی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ جس رستے سے بتی بچے اگر کوئی شخص بتی کے نخل جانے کے بعد اُس رستے سے گزرے، تو اُس کو لڑائی جھگڑا ضرور پیش آتا ہے۔ اسی سبب بتی آلاٹھنا ایک محاورہ ہو گیا ہے، جس کے معنی ہیں لڑنے جھگڑنے کو آنا۔ جو شخص آتے ہی ٹیڑھی رچھی باتیں کرنے لگے، اُس کی نسبت کہتے ہیں کہ تم بتی آلاٹھ کر تو نہیں آئے۔ بھیروں ہندوؤں کے نزدیک شیوجی کا ایک نام ہے اور یہ اُس وقت کے لیے ہے، جب کہ وہ غضبناک ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ان کی خفگی سے تباہی اور بربادی آتی ہے۔ اسی عقیدہ سے بھیروں ناچنا ایک محاورہ بنایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں ویرانی چھا جانا۔ جاہل مسلمان عورتیں ہسٹک پیروں، دیولوں اور پیروں کے نام لیتی اور ان کو مانتی ہیں۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری۔ آسمان پری، دریا پری، نور پری، زین خاں، صدر جہاں، ننھے میاں، شاہ دریا، شاہ سکندر، شیخ سید ماموں الہ بخش۔ سید بربہنہ، پیر پٹیل، شاہ مدار، پیر عقیب، چالیس تن یا چل ابدال جن کے دم قدم سے یہ دنیا قائم ہے۔ عورتیں ان پیروں یا ان بزرگوں کی روحوں میں سے کسی روح کو اپنے سر پر بٹاتی ہیں۔ جو عورت یہ کام کرتی

ہی، وہ جمہرات کے دن خوشبوزیور اور عمدہ پوشاک سے آراستہ ہو کر بیٹھ جاتی اور گمانسنتی ہی۔ جب کوئی پری یا رُح اُس کے سر پر آتی ہی، تو وہ اپنا سر ہلانے لگتی ہی۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں اور وہ ہر ایک کے سوال کا جواب دیتی جاتی ہی۔ اس طریقہ سے رُحوں کے ہلانے کو بیٹھک دینا یا محاضرات کرنا کہتے ہیں۔ اس تبلیغ میں عورتوں کے اس خاص عقیدے کی طرف اشارہ ہی، جس کا ذکر کیا گیا۔ ادنیٰ درجے کے ہندو بھی اسی طرح کسی دیوی، دیوتا، یا بیر کو اپنے سر پر ہلاتے ہیں۔ اُن میں جو مرد اس کام کو انجام دیتا ہی، اُن کو بھگت کہتے ہیں اور عورت کو بھگتانی۔ بیر اُس جن یا خبیث رُوح کو کہتے ہیں، جس کو جادوگر کسی کو ضرر پہنچانے کے لُٹو اس پر مسلط کرتی ہیں۔ مسلمان اُس رُوح کو موکل کہتے ہیں۔ اس سے بیر بٹھانا اور بیر دوڑانا دو محادسے پیدا ہوئے ہیں۔ اُٹن کھٹولا اور پوان یا بان کے الفاظ ہندوؤں کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دیوتا ایک تختِ رداں پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچے تھے اس تخت کو ہوا اُڑا کر لے جایا کرتی تھی۔ پاتال ہند میں زمین کے سب سے نیچے کے طبقے کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے پاتال کے سات طبقے قرار دیئے ہیں۔ ہر طبقے میں ایک زندہ مخلوق آباد ہی۔ پاتال تک کی خبر لانا اسی تبلیغ سے ایک محادہ بنایا گیا ہی۔ پارس ایک خیالی تہر کا نام ہی، جس کی نسبت عام لوگوں میں یہ خیال پھیلنا ہوا ہی کہ اگر یہ تہر لوہے سے چھو ا جائے، تو اُسے سونا بنا دیتا ہی۔ پھلپانی کا لفظ جس سے بھتینی یا چٹیل مراد ہی، عوام کے اس خیال کو یاد دلاتا ہی کہ چٹیلوں یا بھتینیوں کے پاؤں میں سب سے نیچے کی طرف اور ایڑی آگے کی طرف ہوتی ہی۔ پرسی ایک خیالی حسین مخلوق ہی، جس کا سارا جسم عورتوں جیسا ہوتا ہی، مگر بازو پر دار ہوتے ہیں پرستان اُس جگہ کا نام رکھا گیا ہی، جہاں پریاں آباد ہیں۔ پرسی مادہ اور دیویا پریرا زہوتے ہیں پرستان یا پریوں کا اکھاڑہ محادہ میں اُس محفل کو کہتے ہیں، جہاں بہت خوب صورت آدمی جمع ہوں۔ بیر کی طرح پون بھی اُن خبیث رُحوں کو کہتے ہیں، جنہیں جادوگر کسی شخص کے ضرر پہنچانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ پون بٹھانا اور پون دوڑانا یا چلانا وہ محادہ ہے جس کو اس لفظ سے بنائے گئے ہیں۔ بھوت وہ رُوحیں ہیں، جو جسموں سے جدا ہو کر دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مرد کی رُوح بھوت اور عورت کی رُوح بھتینی کہلاتی ہی۔ بھوت لوگوں کے سروں پر آتے ہیں۔ یہ عام خیال ہی۔ بھوت چڑھنا کے ساتھ بھوت اتارنا بھی محادہ میں آگیا ہی، کیونکہ عام خیال یہ بھی ہی کہ منتر کے زور سے بھوت کسی کے سر سے اتارا بھی جاسکتا ہی۔ مسلمانوں کے نزدیک سات سمندر سے مراد بحیرہ شام، بحیرہ قزقم،

بجز عرب، بحیرہ عمان، بحیرہ فارس اور بحرِ آسودہیں؛ مگر ہندوؤں کے سات سمندروں میں سے ایک سمندر نک کا ہے؛ دوسرا دودھ کا، تیسرا گھی کا، چوتھا دہی کا، پانچواں شراب کا، چھٹا گنے کے رس کا اور ساتواں شہد کا ہے۔ عقلی عمل جادو کی وہ قسم ہے، جو شیاطینِ نجات کی مدد سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے علوی عمل وہ ہے، جس میں سائرین و فرشتوں سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ جادو کی نسبت عام لوگوں کا جو عقیدہ ہے، اُس کو یہ دونوں الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ خدا کے اسما و قسم کے مانے جاتے ہیں۔ ایک جلالی جن سے غصہ اور جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرا جمالی جن سے رحم و لطف نمایاں ہے۔ جب خدا کا کوئی جلالی اسمِ ننگی تلوار کی پشت پر پڑے کر پھونکتے ہیں، تو اُسے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن ہلاک ہو۔ اس عمل کو سیفی کہتے ہیں۔ اگر اسمِ مذکور کے پڑھنے میں بے احتیاطی ہو، تو کھتری ہیں کہ یہ عمل الٹا عامل کے لئے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اس حالت کو سیفی کا الٹ جانا کہتے ہیں۔ سانپ کا معنی ام کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ جب سانپ خوش ہو، آہ توہ ایک روشن جواہر منہ سے باہر نکال کر کھنکھل میں رکھ دیتا ہے۔ اُس کی روشنی چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوتی ہے۔ سانپ اس روشنی میں کوسوں سیر کرتا پھرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس کسی کے پاس سانپ کا من ہو، وہ تمام آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نہ آگ اُسے جلا سکتی ہے، نہ پانی اُسے ڈبو سکتا ہے۔ شبِ چراغ بھی ایسا ہی لفظ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک جواہر ہے۔ دریائی گائے رات کے وقت چرنے نکلتی ہے، تو اس جواہر کو منہ سے نکال کر رکھ دیتی ہے اور اُس کی روشنی میں چپرتی پھرتی ہے۔ چرچکنے کے بعد اُس کو اپنے منہ میں رکھ کر دریا میں غوطے لگا جاتی ہے۔ شبِ برات میں لفظ برات کے معنی روزی کے ہیں۔ اس لفظ سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ اس رات کو یعنی شعبان کی چودھویں یا پندرہویں رات کو فرشتے انسانوں کی روزی اور عمر کا حساب آئندہ کے لئے لگاتے اور روزی تقسیم کرتے ہیں۔ ست جگ ہندوؤں کے نزدیک نیا کا پہلا دور ہے، جس میں تیرہ سح اور راستی کے سوا دوسری بات کا نام نہ تھا۔ اس دور کی میعاد سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار برس قرار دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایک دور کلجگ کہلاتا ہے۔ یہ دور چار لاکھ تیس ہزار برس کا ٹھہرایا گیا ہے۔ اس زمانے میں پاپ اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ تریتا جگ اور دوا پر جگ دوا درج ہیں؛ مگر عام لوگوں میں مشہور یہی جگ ہیں۔ چھٹی ہندوؤں کے اعتقاد میں دولت کی دیوی ہے۔ چھٹی گھر میں آنا ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں متقابل ہونا۔ لہذا میں جو چھٹا سو باون ہی گز کا۔ یا لکھا سے جو نخلا سو باون گز کا۔ یہ ایک قیسی مثل ہے۔ اُس موقع پر بولی جاتی

ہی، جہاں چھوٹے بڑے سب شریر اور فتنہ پرداز ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جزیرہ لکنا میں دیورہتے تھے جو بہت بڑے بڑے قد کے ہوتے تھے، یہاں تک کہ اُن کے بچے بھی باون گز سے کم قد نہیں رکھتے تھے اور اُن کا مزاج نہایت کرش اور شریر واقع ہوا تھا۔ میر بھڑی کی کڑھائی۔ ایک تبلیغ ہی جو بیچڑوں سے لی گئی ہے۔ میر بھڑی جسے میر بھوجی بھی کہتے ہیں، بیچڑوں کے سلسلے کا بانی تھا۔ بیچڑے اُس کی نیاز دہاوتے ہیں۔ اُن کا یقین ہے کہ اگر کوئی اس نیاز کی کڑھائی کا حلوا کھائے، تو وہ ناپچھے تھرنے اور بیچڑوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور جب تک بیچڑانہ بن جائے اُسے کل نہیں پڑتی۔ یوہایا یوحی عوام کے خیال میں ایک قسم کا سانپ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس گزرنے پر وہ ایک آواز نکالتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر ہزار برس کے بعد ایک دفعہ چلتا اور چپ ہو جاتا ہے۔ تیسری دفعہ یعنی تین ہزار برس کے بعد یہ قدرت اُسے حاصل ہو جاتی ہے کہ جس شکل اور جس روپ کا چاہے، بن جائے۔ یعنی انسان یا حیوان بننے کی طاقت اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک جن پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کو ہنراد کہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو خاص عمل کے ذریعے ہی اُس کو قابو میں لاسکتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق اُس سے کام لے سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے خیال میں ایک فرضی وجود ہے جو دکھائی نہیں دیتا اور دنیا کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے۔ کبھی کسی طرف ہوتا ہے۔ کبھی کسی طرف مثلاً شنبہ کے دن وہ مشرق میں ہوتا ہے۔ پچھنبہ کے دن جنوب میں، منگل کے دن شمال میں۔ اتوار کے دن مغرب میں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس فرضی وجود کا نام ہندوؤں نے دسا سول رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس دزدہ جس سمت میں ہو، اُس روز اُس سمت میں سفر کرنا نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ سفر کرنے والے پر واجب ہے کہ دسا سول کو بائیں طرف یا اپنی پشت کی طرف رکھے۔ اُس کا سامنے پڑنا یا دائیں ہاتھ پر ہونا از حد منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ الوپا بن ایک قسم کا سرمہ ہے جس کے لگانے سے آدمی آپ تو سب کو دیکھتا ہے، مگر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسے سرمہ سلیمان بھی کہتے ہیں۔ گنگا پارہ کی ایک طلسمی گولی ہے جسے جوگی تیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس گولی کو منہ میں رکھنے سے قوت پر دہرا جاتی ہے اور اس کی مدد سے جوگی جہاں چاہتے ہیں اُڑ کر چلے جاتے جاتے ہیں۔

(دسوم) وہ تلخیں جو خاص خاص سموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مسلمان عورتوں میں دستور یہ کہ نخل کے بعد دو لہا دو لہن کو آنسنے سے سر ہلا کر اور ایک مسخ دو پٹہ اڑھا کر بٹھا دیتی ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک آئینہ اور قرآن شریف میں سے سورہ اخلاص نخل کر رکھ دیتی ہیں۔ اس رسم کو آرسی مصحف کہتے ہیں۔ آرسی سے مراد آئینہ ہے۔ آئینہ رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ دو لہا دو لہن ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ لیں۔ سورہ اخلاص سے غرض یہ ہے کہ میاں بیوی میں ہمیشہ اخلاص بنا ہے۔ یو آٹھان ہندوؤں کی ایک رسم ہے جو کاکت سدی اکادشی کو منائی جاتی ہے۔ دشنو ہندوؤں کے نزدیک چار مہینے سے اس تائیں نخل سوتے بچتے ہیں۔ ہندو اس تائیں کو ایک معین جگہ لپ پوت کر گھرایا درگیر دے اس پر نقش دنگا بناتے ہیں اور وہاں پوجا کی چیزیں رکھ کر ان کو ایک تھالی سے ڈھک دیتے ہیں۔ گھر کی کوئی عورت یا کوئی برہمنی ہاتھوں سے اس تھالی کو بجاتی جاتی اور یہ کہہ کر ”اٹھو دیو اٹھو“ دشنو کی تعریف کے فقرے گاتی جاتی ہے۔ سویمبر ہندو کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ جب اجاؤں یا عالی خاندان کے لوگوں میں کسی لڑکی کے لئے برادر کا رہوتا تھا تو تمام راجاؤں اور امیروں کو پہلے سے اطلاع دی جاتی تھی۔ تائیں معین پر سب جمع ہو جاتے تھے۔ لڑکی بھرے جلیے میں آکر شہزادوں اور امیر زادوں کے کرب دیکھتی تھی اور ان میں سے جس کو اپنا شوہر بنانا پسند کرتی تھی، اس کے گلے میں اپنے ہاتھ سے پھولوں کا ہار ڈال دیتی تھی۔ دسپوں کا کوئڈا مسلمان عورتوں کی ایک رسم کی تبلیغ ہے۔ جب کسی لڑکے کی میس بھگتی ہیں، تو اس خوشی میں اس کی ماں حضرت خاتونِ جنت کی نیاز دلواتی ہے اور اس میں رشتہ دار جمع کیے جاتے ہیں۔ آئین ایک رسم ہے جو قرآن کے ختم ہونے یا اس کا کوئی حصہ ختم ہونے پر ادا کی جاتی ہے۔ لڑکا جب کتب میں قرآن کی تعلیم پاتا ہے، اس کے تمام شاگرد اور اساتذ اس لڑکے کے مکان پر پہنچ کر ایک ناص نظم بہ آواز بلند پڑھتے ہیں۔ ایک لڑکا پڑھتا ہے۔ باقی سب لڑکے ہر شعر پر پکار کر آمین کہتے جاتے ہیں۔ نظم پڑھنے کے بعد دعا مانگی جاتی ہے۔ شیرینی تقسیم ہوتی ہے اور اس کو لڑکے کے ماں باپ حسبِ توفیق نذر دیتے ہیں۔ رت جگا ایک اور رسم ہے جو بیاہ سال گروہ، بسم اللہ یا کسی اور تقریب پر منائی جاتی ہے۔ اس موقع پر عورتیں جمع ہوتی ہیں اور رات بھر جاگتی ہیں۔ رات کو کڑھائی ہو کر دن کو گلنگوں اور رسم پر اڈل اللہ میاں کی سلامتی پڑھی جاتی، پھر زردے یا خشک برصہرت فاطمہ کی نیاز دلوئی جاتی ہے۔ مسلمان عورتوں میں شادی کے وقت کی ایک خاص رسم ہے جسے زبائیں چنونا

کہتے ہیں۔ نبات، نبات سے بگڑا ہی جس کے معنی ہیں مصری کی نوڈیاں دھن کے دونوں مونڈھوں، کنیسوں، پٹیہ اور ہاتھوں پر رکھی جاتی ہیں۔ دولہا سے کہا جاتا ہے کہ ان ڈلیوں کو ایک ایک کر کے مونڈھ سے اٹھاؤ اور نہ لگاؤ۔ یہ حقیقت میں ایک ٹوٹکا ہے، جس سے غرض یہ ہے کہ دولہا ہمیشہ دھن کا فرماں بردار ہے۔ مارے دکھایاں اور رسم ہے، جو ایام زچگی میں ادا کی جاتی ہے۔ زچہ کو رات کے وقت چھٹی کے روز دالان سے باہر لا کر تار کڑتی ہیں، دُور توں کے ہاتھ میں تلواریں ہوتی ہیں اور وہ اُس کے ساتھ محافظ بن کر آتی ہیں۔ زچہ بچے کو گود میں۔ قرآن شریف کو سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور سات تا سے گنتی ہے عورتوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے زچہ کو جن دپری کا خوف نہیں رہتا۔ بیوی کی صحیح ایک اور رسم ہے۔ اکثر شادی یا کسی مراد کے برائے پر عین حضرت فاطمہ کے نیاز دلواتی ہیں۔ اس میں بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔ سہاگن اور پارسا عورتیں شامل ہوتی ہیں اگر کوئی عورت دُخاؤ نہ کر چکی ہو، تو اُس کو شریک نہیں کرتیں، بلکہ سیدانیوں کو اس نیا ز کا کھانا کھانا ادلی سمجھتی ہیں جہاں گیر کے زلف سے یہ رسم جاری ہوئی ہے۔ پھول ہونا ایک اور رسم ہے جو مرنے سے تیسرے دن ادا کی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں دستور ہے کہ مرنے سے تیسرے دن مردے کی ہڈیاں، جنہیں وہ پھول کہتے ہیں، چنی جاتی اور دیا گنگا میں بہائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں میں بھی تیسرے دن مرنے کی فاتحہ ہوتی ہے۔ جنوں کے دانوں پر کلمہ بٹھا جاتا ہے، تاکہ مرنے کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ فاتحہ کے وقت کچھ ارگیا اور کچھ پھول لئے جاتے ہیں۔ سوہ فاتحہ پڑھ کر ہر ایک حاضر مجلس ایگے کے پیالے میں پھول ڈالتا ہے اور یہ پھول دُخو شہو مرنے کی قبر پر بھیجی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی رسمیں ہیں مثلاً بسم اللہ، چھٹی، چوتھی، منگنی، ستوانا، ہندی، برسی، یا ساچن، چالیسواں وغیرہ۔

(چچا دم) وہ تمہیں جن کی بنیاد فرضی تھیں پر ہے۔

غیر بود کرنا ایک محاورہ ہے، جسے عام آدمی بولتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں مطلب خبط کرنا۔ اس کا قصہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک بے وقوف آدمی بوستان پڑھتا تھا۔ جب سعدی کے اس شعر پر پہنچا

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود

در ایام بوجہ بن سعد بود

تو اُس نے استاد سے پوچھا :- غنّہ بود کے کیا معنی ہیں ۔ بلاغت میں سے اُس نے بلا کو بُدا کر کے دوسرے لفظ رُود سے ملا دیا اور غنّہ بود کو ایک لفظ سمجھا ۔ ٹیڑھی کھیر کے معنی ہیں مثل کام ۔ کہتے ہیں کہ ایک اندھے سے کسی شخص نے پوچھا ۔ حافظ جی ! کھیر کھاؤ گے ، اُس نے کہا ، کھیر کسی ہوتی ہے ۔ اس نے کہا سفید ، پوچھا سفید کیسی ، کہا جیسے بگلا ۔ اُس نے پوچھا ، بگلا کیسا ہوتا ہے ۔ اس نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے دکھایا کہ ایسا ۔ اندھے نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر کہا ۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ۔ ہم سے نہیں کھائی جائیگی ۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے ۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی زمیندار کے ہاں بھینس کی چوری کی تھی ۔ قاضی نے تمام مشتبہ آدمیوں کو جن میں چور بھی تھا ۔ سامنے کھڑا کر دیا ، پھر اپنے ایک پیادے سے کہا ۔ میں جس کی طرف اشارہ کروں تم اُسے گرفتار کر لینا ۔ پھر اُس نے کہا ۔ دیکھ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہے ۔ چور کے دل میں ڈبکا تھا ہی ۔ اُس نے فوراً اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالا اور اس حرکت سے وہ شناخت کر کے پکڑا گیا ۔ نیبو نچوڑنا خواندہ مہمان کو کہتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ایک سرلے میں ایک مُفت خور ٹھہرا ہوا تھا ۔ اُس کا دستور تھا کہ جب کوئی مسافر کھانا کھانے بیٹھتا ، تو ایک نیبو لے کر دسترخوان پہنچ جاتا ۔ مسافر کے آگے سالن دیکھ کر کہتا ہے کہ حضرت نیبو اس کا بناؤ ہے ۔ ذرا اس کو نچوڑ کر فرما دیکھئے ۔ وہ بیچارہ مرد میں آکر اُس کو بھی کھانے میں شریک کر لیتا ۔ طفیلی کا لفظ بھی اسی طرح پیدا ہوا ہے ۔ طفیل کو ذکا کا ایک شاعر تھا ۔ اس کی عادت تھی کہ جب لوگوں کو کسی دعوت میں جاتے دیکھتا تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہولیتا تھا اور بے تکلف دعوت میں شریک ہو جاتا تھا ۔ ناؤ میں خاک اُڑانا ایک محاورہ ہے ، جس کے معنی ہیں جھوٹا الزام لگانا ۔ کہتے ہیں کہ ایک شیرازہ ایک بکری دونوں کشتی میں سوار تھے ۔ شیر نے اُس کو کھانے کی نیت سے کہا کہ تو کشتی میں کیوں خاک اُڑاتی ہے ۔ اُس نے کہا ۔ جناب یہاں خاک کہاں ہے جسے میں اُڑاؤں ۔ شیر نے غصے میں آکر کہا ۔ تو ہماری بات کو جھٹلاتی ہے ۔ دیکھ تو میں تیری گستاخی کا کیا فرما چکھاتا ہوں ۔ یہ کہہ کر اُس پر حملہ کیا اور پھاڑ پھیر کر اسے کھا گیا ۔ نیکی کرادور دریا میں لال اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ بے دریغ نیکی کر ۔ اس بات کی پروا نہ کر کہ اس کا انجام بھی کچھ کے قصبے میں لکھا ہے کہ ایک شخص دریا میں ہر روز درود دیا کرتا تھا ۔ خدا کی ۔ اس کا منتقل قصہ قائم طائی کے قصبے میں دیکھنا چاہیے ۔ اود بلاؤ کی نہ ہو ۔ کہتے ہیں کہ جب کئی اود بلاؤ ملکر مچھلیاں مارتے ہیں ، تو دریا ۔

کا حصہ الگ لگاتے ہیں۔ مگر کوئی نہ کوئی اود بلا داپنے حصے کو کم سمجھ کر سارے حصوں کو گڈ مڈ کر دیتا ہے۔ پھر انٹر حصے لگائے جاتے ہیں اور اس تقسیم کا انجام بھی یہی ہوتا ہے۔ غرض کہ ان میں برابر جھگڑا ہوتا رہتا ہے اور کسی طرح فیصلہ ہونے میں نہیں آتا۔ نازی کا ٹکا اُس نفاثتہ بات کو کہتے ہیں، جس کا بدلا کہیں نہ کہیں ضرور مل کر رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شریر لڑکا ناز پڑھتے میں لوگوں کی ٹانگیں گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب سجدہ کرتے وقت اُس نے کسی نازی کی ٹانگ گھسیٹی، تو اُس نے ملامت کرنے کی بجائے سلام پھیر کر چپکے سے ایک ٹکا اُس کے حوالے کیا۔ تاکہ یہ مزا پڑ جائے، تو وہ کہیں نہ کہیں اس کی سنراپائے۔ اُسے تو ٹکے کی چاٹ لگ ہی گئی تھی، اتفاق سے ایک جلاہ پٹمان کے ساتھ بھی اُس نے یہی حرکت کی۔ اُس نے سلام پھیرتے ہی تلوار میان سے نکالی اور اُس شریر لڑکے کی گردن اڑادی۔ آنکھوں کی سونیاں رہ گئی ہیں اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ بہت سا کام ہو چکا ہے۔ تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ایک سوداگر بچے کی دوستی کسی جادوگرنی سے تھی۔ وہ اُس کی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی ایک روز اُس نے جادو کی ایک پڑیا سوداگر بچے کے گھر میں پھکوائی۔ اتفاق سے وہ پڑیا بجائے اس کے کہ اُس کی بیوی کو کچھ ضرر پہنچائے، خود سوداگر بچے کے بدن پر جا پڑی۔ اُس کا پڑنا تھا کہ اُس کے سائے تن بدن میں سونیاں ہی سونیاں جھگ گئیں۔ سوداگر بچہ اس تکلیف کے ماتھے بیہوش ہو گیا۔ بیوی نے صبح کی ناز پڑھ کر میاں کی یہ حالت دیکھی، تو وہ فوراً سونیاں نکالنے میں مشغول ہو گئی۔ ہاتھ سے سونیاں نکالنے میں تکلیف ہونے لگی، تو اُس نے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں، تھوڑی سی سونیاں نکالنی باقی تھیں کہ نھر کا دقت آگیا۔ اُس نے باندی سے کہا کہ میں نھر کی ناز پڑھتی ہوں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ اب میری جگہ تو کام کر۔ باندی سونیاں نکالنے لگی، بیوی نھر کی ناز سے فاسخ نہیں ہوتی تھی کہ سونیاں سب نکال لی گئیں۔ سوداگر بچہ کو ہوش آگیا۔ اُس نے آنکھ کھول کر دیکھا، تو بیوی اُس کے پاس نہ تھی۔ باندی اُس کی خدمت کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کو بیوی سے نفرت ہو گئی۔ اُس نے اندازہ کیا کہ بیوی بنا لیا اور بیوی کو باندی کی خدمت پر مامور کر دیا۔ بھیگی پٹی بتانا ایک تلمیحی محاورہ ہے، جس کے سامنے کرنا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مکان کے دالان میں شب کے وقت پڑے پڑے کبھی ایک طرف پڑا تھا۔ نوکر کو اُس کے آفانے کئی دفعہ کام کے لئے دالان سے کربان کر دیتا تھا، تاکہ اُسے باہر نہ جانا پڑے۔ آخر میں آفانے کہا۔ باہر نکل

میں بارش ہو رہی تھی۔ ذرا باہر جا کر تو دیکھ اب بارش تم گئی ہے، یا ہو رہی ہے۔ نوکر نے جواب دیا کہ ابھی بارش ہو رہی ہے۔ آقائے پوچھا۔ تو نے کس طرح معلوم کیا۔ اُس نے کہا۔ باہر سے بتی اندر آئی تھی میں نے اُس پر ہاتھ پیر کر دیکھا، تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ جون پور کا قاضی محاورہ میں احمق آدمی کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شہر کے کسی کتب میں اُس مکتب کا استاد اپنے ایک شاگرد پر خا ہو رہا تھا۔ اُٹنا سے خٹکی میں اُس نے کہا۔ نالائق! تو میرا احسان نہیں مانتا کہ میں نے تجھے گدھے سے آدمی بنایا۔ ایک کھار نے جو اُس کتب کے قریب گزر رہا تھا، یہ بات سنی۔ فوراً کتب میں آیا اور اُس نے استاد سے کہا کہ میرے پاس بھی ایک گدھا ہے۔ اگر آپ اُسے آدمی بنادیں، تو بڑا احسان ہو۔ استاد اُس کی حماقت کو تاز گیا۔ اُس نے ہنسی کے طور پر کہا۔ اگر تم سٹور و پیو دا اور اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ جاؤ، تو سال بھر کے بعد میں اُس کو آدمی بنا دوں گا۔ کھار اس شرط پر راضی ہو گیا۔ گدھا استاد صاحب کے پاس چھوڑ گیا اور سٹور و پیو بھی دے گیا۔ سال بھر کے بعد آیا، تو استاد اُس گدھے کو فروخت کر کے دام کھرے کر چلے گئے۔ اُس نے کہا۔ میرا گدھا جسے آپ نے آدمی بنادیا ہوگا، واپس کیجئے۔ استاد صاحب نے کہا۔ میں نے اُس کو آدمی ہی نہیں بنایا، بلکہ کھاڑک عالم بھی بنادیا ہے۔ اب وہ جونپور میں قاضی کے عہدہ پر مامور ہے۔ یہ سن کر کھار جونپور سے پھولانہ سہایا۔ فوراً چھٹی، پلانا ہمراہ لے جان پور کو روانہ ہوا۔ قاضی صاحب عدالت کر رہے تھے۔ کوئی مقدمہ اُن کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ کھار اُن کے سامنے ذرا دُور کھڑا ہو گیا اور قاضی صاحب کو چھٹی پلانا دکھانے لگا، تاکہ وہ اپنے مالک کو پہچان لیں اور اُس کے پاس چلے آئیں۔ قاضی نے یہ عجیب حرکت دیکھی، تو آدمی بھیج کر اس حرکت کا سبب یافت کیا۔ کھار نے سارا ماجرا اول سے آخر تک کہہ سنایا۔ جب قاضی صاحب کو یہ حال معلوم ہوا، تو اس خیال سے کہ لوگوں میں اُن کی ہنسی نہ اڑے، اُس کو ایک مقول رستم دے کر ٹالا اور اُس سے خدا خدا کر کے پیچھا چھڑایا۔ شیخ جلی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو دُور راز کا منصوبے باندھے۔ یہ ایک فرضی شخص لوگوں نے گڑھ لیا ہے اور اس قسم کی تمام باتیں جو دُور راز کا منصوبوں اور تجویزوں سے تعلق رکھتی ہیں، اُس کے نام کے ساتھ چپکا دی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ شیخ جلی کو ایک شخص نے مزدوری پر لگایا۔ ایک ٹوکری میں شیشہ آلات بھر کر اُن کو دیے کہ فلاں جگہ اس ٹوکری کو پہنچا دو۔ شیخ جلی نے رستے میں ایک جگہ ٹوکری کو الگ رکھ کر سوچنا شروع کیا کہ آج جو مزدوری مجھے وصول ہوگی، اس سے ایک درہا اور ایک مرغی خرید کر دوں گا۔ مرغی کو اندونٹ

بٹاؤ لگا۔ اُس سے بہت سے بچے حاصل ہونگے۔ جب بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی، تو اُن کو بیچ کر ایک بکری اور ایک بکرا خرید کر دوں گا اور اُس کی نسل بڑھاؤں گا۔ بکریوں کا گلہ جب بڑھ جائیگا، تو اُس کو فروخت کر کے گلے لوں گا۔ گلے کی نسل اسی طرح ترقی کرے گی۔ گایوں کا گلہ بیچ کر بھینسیں لوں گا۔ جب بہت سی بھینسیں ہو جائیں گی، تو اُن کی تجارت سے میں امیر و کبیر ہو جاؤں گا۔ ایک بڑے گھرانے میں شادی کر دوں گا۔ بیوی ایسی تلاش کر دوں گا، جو حسین ہو۔ میں اُس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھوں گا۔ اگر وہ نافرمانی کرے گی، تو میں اُس کی کمر پر زور سے ایک لات جڑوں گا۔ شیخ جی اس وقت غصے میں تھے۔ خیالی بیوی کی جگہ آپ کی لات تو کرے پر پڑی اور تمام شیشے چور چور ہو گئے۔ لال بھکڑا اُس شخص کو کہتے ہیں، جو ہر بات کا جواب دینے اور ہر معاملہ میں رائے دینے پر تیار رہتا ہو۔ اصل میں تو احمق ہو، مگر اپنے تئیں سب سے زیادہ عقلمند خیال کرتا ہو۔ شیخ چلی کی طرح لال بھکڑے ہی لوگوں نے ایک فرضی شخص تراش لیا ہے اور اس قسم کی تمام رائیں جو حقائق پر مبنی ہوں، اُس کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جب گاؤں میں لال بھکڑا رہتا تھا، اُس کے رہنے والوں نے ہاتھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک ہاتھی اس گاؤں سے گزرا۔ اُس کے پاؤں کے نشان زمین پر پڑے۔ گاؤں والوں نے ہاتھی کو تو نہیں دیکھا۔ اُس کے پاؤں کے نشان ضرور دیکھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ نشان زمین پر کیوں کر ہو گئے۔ لال بھکڑا کو وہ نشان لا کر دکھائے اور اُن کی حقیقت دریافت کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ارے بے وقوف! میرے سوا کوئی اس معنی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہرن چکی کے پاٹ چاروں پاؤں سے باندھ کر کو داہی اور اس سے یہ نشان زمین پر بنے ہیں۔ اسی طرح ایک دفعہ ایک لڑکا گھر کے ایک ستون کو ہاتھوں کے حلقے میں لے کھڑا تھا۔ اس اثنا میں اُس کا باپ باہر سے چنے چاتا آیا۔ لڑکے نے اسی حالت میں اُس سے چنے مانگے۔ باپ نے اُس کی مٹھی میں چنے دیدیئے؛ مگر ابیکش آئی کہ ستون سے ہاتھ کیوں کر نکلے۔ اگر ہاتھ جدا کرے، تو چنے زمین پر گر نیگے اور یہ اُسے منظور نہ تھا۔ لڑکا رونے لگا۔ باپ کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ وہ دوڑا دوڑا لال بھکڑے کے پاس پہنچا اور اُس کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُس نے مچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ بھلا میرے سوا کون اس تدبیر کو بتا سکتا ہے۔ جاؤ۔ گھر کی چھت کو اُدھیر ڈالو۔ جب ستون پر سے چھت ہٹ جائیگی تو لڑکے کو آسانی سے تم چھت پر کھینچ لو گے۔ مٹھی سے چنے بھی گرنے نہ پائیں گے اور لڑکا بھی صحیح سلامت ستون سے نکل آئیگا۔ یک نہ شد دوشد۔ ایک تلمیسی مثل ہے۔ یہ اُس موقع پر بولی جاتی

ہی، جب کہ ایک عجیب مر کے بعد دوسرا عجیب مرد واقع ہو۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو ایک ایسا منتر معلوم تھا کہ اُس کے ذریعہ سے وہ مردے کو جگا سکتا اور اُس سے باتیں کر سکتا تھا۔ دوسرا ایک اور منتر بھی معلوم تھا، کہ جس کے ذریعے سے وہ مردے کو باتیں کرنے کے بعد پھر قبر میں سلا دیتا تھا۔ اگر کسی مردہ کے گھر والوں کو راز کی کچھ باتیں مردہ سے پوچھنی ہوتیں، تو اُس عامل سے جا کر التجا کرتے تھے۔ وہ اپنے عمل سے مردہ کو جگا کر سب کچھ پوچھ دیتا، پھر اُس کو دوبارہ سلا دیتا تھا۔ مرتے وقت اُس نے ایک شاگرد کو وہ دونوں منتر بتائے۔ شاگرد نے بطور آزمائش کے ایک قبر پر پہلا منتر پڑھا۔ مردہ جاگ اُٹھا اور اُس سے باتیں کرنے لگا اور اُس نے ہر سوال کا جواب دیا؛ مگر دوسرا منتر اتفاق سے یاد نہیں آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردہ اُس کے پیچھے ہولیا۔ اُس نے گھر اگر استاد کو قبر سے اُٹھایا، تاکہ وہ پہلے منتر کا تار دوبارہ بتائے؛ مگر اس عالم میں وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ پہلے مردہ کی طرح یہ نیا مردہ بھی اب اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اس موقع پر بے ساختہ اُس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔ اس مثل کی طرح ایک اور فارسی تلمیحی مثل اُردو میں مستعمل ہے۔ گربہ کشتن روز اول اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ رعب پہلے ہی دن جانا چاہیئے کہتے ہیں۔ دو دوستوں نے ایک ساتھ شادی کی۔ دونوں کی بیویاں بد مزاج نکلیں۔ ایک کی بیوی خاوند پر غالب آئی۔ دوسرے کی نہایت فرماں بردار ثابت ہوئی۔ پہلے دوست نے دوسرے سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بد مزاج بیوی کو کس طرح طمع کیا۔ اُس نے کہا۔ اول ہی روز جب ہم میاں بیوی کھانے پر بیٹھے، تو ایک بٹی بھی دسترخوان پر آ بیٹھی۔ میں نے کہا۔ چلی جا، وہ نہ گئی۔ تب میں نے فوراً اٹھ کر اُسے مار ڈالا۔ اس واقعے سے میری بیوی پر میرا رعب چھا گیا۔ وہ ڈرنے لگی کہ جس نے ذرا سی بات نہ ماننے پر بٹی کو مار ڈالا، وہ خدا جانے میرا کیا حال کرے گا۔ یہ سن کر دوست نے بھی اس پر عمل کیا؛ مگر چونکہ اُس کی بیوی اُس کی عادت سے واقف ہو چکی تھی اور اُس کے مزاج پر غالب آ چکی تھی؛ اس لئے کچھ پیش نہ گئی۔ اس کا حال معلوم کر کے دوست نے کہا۔ بھائی گربہ کشتن روز اول بعد کا رعب جانا کام نہیں دیتا۔ کہاں اُجھوج اور کہاں گنگائیلی۔ یہ بھی ایک تلمیحی مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امیر غریب کی نسبت نہیں؛ مگر تقدیر کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب راجہ موہن پڑ پڑی اور راج پاٹ چمن گیا، تو وہ مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک فہم مانگتا تھا، ایک رانی کے پاس جا نکلا۔ ابھی وہ محل ہی میں تھا کہ ایک کاٹ کی مورتی رانی کا کھونٹی پر لٹکا ہوا ہار نکل گئی۔ رانی نے سمجھ کو چور سمجھ کر راجہ کے پاس صیغہ دیا۔ اُس نے چوری کی سزا میں اُس کے ہاتھ پاؤں کٹوائیئے۔ وہ اسی بچارگی کی حالت میں تھا کہ گنگائیلی اُدھر آ نکلا۔

گھر میں اولاد نہ تھی۔ اس لکڑ منڈھی کو غنیمت سمجھ کر اپنے گھر پر لے گیا۔ علاج کیا تو اچھا ہو گیا۔ کو لھو چلانے کی خدمت پُہر ہوئی۔ ایک دن رات کو کو لھو چلا رہا تھا اور دیکر راگ گارہا تھا۔ راجہ کی بیٹی نے اُس وقت محل کا چراغ گل کرنے کا حکم دیا؛ مگر چراغ جب بجھائے جاتے، تو راگ کے سروں کے اثر سے جل اٹھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ گنگا تیلی کے گھر میں کوئی شخص دیکر راگ گارہا ہے۔ صبح کو اُس نے راجہ کے سر پر کرنا دی کا پیغام گنگا تیلی کے گھر بھجوا دیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تقدیر سے ہاتھ پاؤں بھی نکل آئے۔ کاٹ کی مورتی نے بھی ہار اُگل دیا۔ راجہ پاٹ بھی دوبارہ نصیب ہوا۔ راجہ ملنے کے بعد راجہ صبح نے گنگا تیلی کو ہمیشہ اپنا باپ سمجھا اور اس کو مالامال کر دیا۔

اُردو زبان کی ادبی اور غیر ادبی تلمیحات پر ہم کافی بحث کر چکے ہیں اور ہر قسم کی تلمیحات کی مثالیں بھی ہم نے تحریر کر دی ہیں۔ ہم نے اس مضمون میں تمام تلمیحات کو گمیر لینے کی کوشش نہیں کی؛ تاہم اگر وہ تمام تلمیحات جو ہماری زبان کی نظم و نثر میں مستعمل ہیں عام بول چال میں رائج ہیں، ایک جگہ جمع کر دی جائیں، تو ان پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اس نتیجے پر پہنچ جائیگا کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ہزاروں خیالات ہیں، جن کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس ہزاروں قالب نہیں ہیں۔ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں تلمیحات کی یہ کثرت ہے کہ ان کے لئے مستقل فرہنگیں تیار کی جاتی ہیں جن میں فرہنگ نگاران تلمیحوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کرتے ہیں اور ہر تلمیح کی تشریح کرتے ہیں۔ اگرچہ تلمیحات کی کثرت کے سبب باشندگانِ یورپ ہر قسم کے خیالات کو مناسب سا پنوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ تاہم ان کی پیاس نہیں بجھی۔ وہ دنیا کی مختلف قوموں کی دیوتاؤں کے قصے معلوم کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی عقائد اور وہام کا سرخ لگاتے ہیں ان کی تاریخوں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی اور غیر مذہبی افسانوں کو اپنی زبانوں کے سانچے میں ڈھالتے ہیں ان کے شاعرانہ خیالات پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں کو ترجمہ کا لباس پہناتے ہیں۔ اور اس کام ذخیرہ سے ادبیات کے لئے تلمیحات اخذ کرتے ہیں۔ تاکہ ان کو ہر قسم کے خیالات و افکار کے ادا کرنے کا سامان پہلے سے زیادہ وسیع ہو۔ برخلاف اس کے ہمارے ہم زبان امت پرست ہیں۔ اگر غیر زبان کے کسی لفظ میں لہلہ فارسی نے تغیر و تبدل کیا ہے یا یونانیوں نے کوئی تبدیلی کی ہے تو اُس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگر یونانیوں نے غیر زبان کے کسی لفظ کے ساتھ اپنا لاف لگا کر کوئی نیا لفظ بنالیا ہے تو اُس کو بھی واداری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر عربوں نے غیر زبان کے کسی لفظ سے کوئی نیا لفظ بنالیا ہے تو اُس پر بھی ناک بھون نہیں چڑھاتے۔ اگر اہلِ ایران یا اہلِ عرب میں

تلمیحات کا دائرہ وسیع
کرنے کی ضرورت

کسی نے کوئی نئی تلمیح کسی تاریخ یا افسانہ کی بنیاد پر وضع کر لی ہے، تو اس پر بھی رضامند رہتے ہیں؛ لیکن اگر ہمارے ملک کا کوئی آدمی غیر زبان کے کسی لفظ میں تصرف کرے، یا عربی فارسی کے کسی لفظ کے ساتھ ہندی زبان کا کوئی سابقہ یا لاحقہ لگائے، یا کسی لفظ پر مصدر کی علامت لگا کر کوئی نیا مصدر بنائے، یا کوئی جدید تلمیح استعمال کرے، تو اس پر اعتراضات کی بوجھار ہوتی ہے اور قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ حضرات موجوں زبان میں سے بہت سے الفاظ کو ترک کرتے جاتے ہیں اور اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں؛ مگر ایسی کوئی تدبیر نہیں کرتے، جس سے ہماری زبان وسیع ہو۔ ہمارے ادبیات کا دامن فراخ ہو۔ ہماری لغات میں الفاظ کی تعداد زیادہ ہو، ہمارے اولیٰ خیالات کے وقت میں ترقی ہو۔

اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ زبان سے غفلت کرنا ایک ایسا گناہ ہے، جو کسی طرح قابل معافی نہیں ہے۔ اخبارات و رسالوں کے مرتب کرنے والے، شاعر، انشا پرداز اور مصنف، جنہوں نے اب تک زبان کی طرف سے غفلت کا اظہار کیا ہے، اگر چاہیں، تو نئے الفاظ، نئے محاورات، نئے استعارات، نئی اصطلاحات اور نئی تلمیحات سے ہماری زبان کو مالا مال کر سکتے ہیں۔ میں عام زبان کی توسیع پر یہاں اظہار خیالات نہیں کرتا۔ صرف تلمیحات پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ موجودہ تلمیحات کا بیشتر حصہ عرب و ایران سے لایا گیا ہے۔ ہندوستانی تلمیحات عام بول چال میں کسی قدر ہیں؛ مگر وہ لائق شمار نہیں ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں اور ان کے ادبیات سے نفرت و گریز کرنے کے بعد کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اردو زبان کو ہندوستان کی مشترک زبان کا خطاب دیں۔ اگر آپ جرمن، فرانسیسی، یا انگریزی زبان کی لغات کھول کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انھوں نے تمام دنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کوئی مذہب کوئی زبان کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ملے گی، جس کے عقائد، رسوم، ادہام، تاریخ اور ادب کے متعلق ضروری الفاظ ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود نہ ہوں۔ گویا انھوں نے اپنی زبانوں کے ادب کو ایک عالم گیر ادب بنا دیا ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ بات شرم کی نہیں ہے کہ ہم نے اپنی زبان کو اب تک ہندوستانی زبان کہلائی کا مستحق بھی ثابت نہیں کیا۔ اگر ہم فراخ دل ہوتے، اگر ہم میں تعصب کی جھلک نہ ہوتی، اگر ہم کو اپنی زبان سے محبت ہوتی، اگر ہم اپنی زبان کے ساتھ اپنے وطن کی عزت بھی کرنا چاہتے، تو پھر ہمارا فرض تھا کہ قطعی تو میں ہندوستان میں آباد ہیں، ان کے عقائد و ادہام، ان کے رسم و رواج اور ان کی تاریخ و ادب کے تمام ضروری الفاظ اپنی

زبان میں داخل کر لیتے اور اس کا دائرہ اس قدر وسیع کرتے کہ ہندوستان کی کوئی موجودہ زبان اُس کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ اگر عام بول چال میں تغیر و تبدل کرنے کا اختیار ہم نہیں رکھتے، تو یہ بات تو ہماری قدرت میں ہی کہ ہم اپنے ادبیات کا دائرہ وسیع کر دیں اور اُس کو ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ باشندوں کے لئے قابل مطالعہ اور لائق انس بنادیں۔ اُردو زبان کے بنانے میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اُس کے ادب میں صرف اسلامی ادبیات کے آثار موجود ہیں۔ ہندو قوم کے ادبیات کا کوئی نشان نہ ہماری نظر میں ہے، نہ نظم میں۔

شاید ایک مقرر اس موقع پر یہ اعتراض اٹھائے کہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد اُن کے دیوتاؤں کے قہقہے، اُن کے ننگون دادا ہا، اُن کی تیرج کی غیر معتبر کہانیاں اس قابل نہیں ہیں کہ مسلمان اُن کو تسلیم کریں۔ حالاں کہ وہ توحید کے ماننے والے ہیں اور معقول پسند ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اب بھی ہمارے ادب میں ایسی سینکڑوں باتیں داخل ہیں جو نہ مذہب کے لحاظ سے قابل تسلیم ہیں، نہ عقل کے لحاظ سے۔ اگر ہم مذہب یا عقل کا پاس کرتے ہیں، تو لازم ہے کہ ہم تمام ایسی باتوں کو اپنے ادبیات سے نکال دیں۔ یہ تو ایک الزامی جواب ہے۔ اصلی اور حقیقی جواب یہ ہے کہ شاعری اور انشا پر اُری میں ایسی تمام باتیں اس لئے داخل نہیں کی گئیں کہ وہ مذہب یا عقل لائق تسلیم ہیں؛ بلکہ اس لئے داخل کی گئی ہیں کہ وہ اداسے خیالات کے سانچے ہیں۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ ”ہمالیہ پہاڑ دیو کی طرح سینہ تانے کھڑا ہے اور ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے تیار ہے“ تو اُس فقرہ سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ اس کا کہنے والا دیو کے وجود کا قائل ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ہمالیہ کے بلند سلسلہ نے ہندوستان کو ایک طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کہے کہ ”روزگار غنقا ہو گیا ہے“ تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائیگا کہ روزگار نہیں ملتا۔ نہ یہ کہ اس فقرہ کا بولنے والا اعتقاد کے معدوم ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔ ہر شخص جو کسی ناول یا ناول کو پڑھتا ہے، اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک مصنوعی قصہ پڑھ رہا ہوں، تاہم جب کوئی ہنسی کی بات اُس میں آتی ہے، تو ہنس پڑتا ہے اور اگر کوئی درد انگیز واقعہ پڑھتا ہے، تو اُس کے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ فطرت انسانی کے اس گرسے ہر شاعر، ہر انشا پرداز ہر قصہ نویس اور ہر دماغ اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے؛ اس لئے وہ حقائق کو اُن فرضی دخیالی باتوں کے پیرائے میں پیش کرتا ہے، جن سے اُس کے مخاطب مانوس ہوں۔ اُس کو مطلق اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ لغافہ جس نسبت پر کردہ اپنے خیالات نظر کے سامنے لاتا ہے۔ اصلی ہے، یا نقلی۔ مولانا روم نے اسی نکتہ کو بیان کیا ہے، جہاں فرمایا ہے کہ

خوشتر آں باشد کہ ستر دلبر اں
گفتہ آید در حدیث دیگر اں

پس جب ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں اداسے خیالات کے سانچوں کی تعداد بڑھادیں اور اس غرض سے ہندو مذہب، ہندو دیومالا، ہندو تاریخ اور ہندو ادب کی تعلیمات کا اضافہ کریں تو اس سے ہمارے مذہب اور عقل پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ نہ کوئی چیز ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ان چیزوں کے وجود پر ہم یقین کریں۔ بلکہ اس اضافہ سے ہمیں حسب ذیل فوائد حاصل ہونگے:-

- (۱) مختلف خیالات کے ادا کرنے پر ہم پہلے سے زیادہ قادر ہو جائیں گے۔
- (۲) یہ الزام ہم پر سے دور ہوگا کہ ہم محض مذہبی تعصب کی بنا پر ہندو ادبیات سے گریز کرتے رہے۔
- (۳) ہندو ہمارے ادبیات سے پیشتر کی نسبت زیادہ مانوس ہو جائیں گے۔
- (۴) ہماری زبان صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان اور ہمارا ادب صحیح معنوں میں ہندوستانی کہلانے کا مستحق ہوگا۔

(۵) ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد مضبوط ہوگی اور حب وطن کے میدان میں آسانی سے دونوں توطیہ ایک ساتھ دوڑیں گی۔

اس نقطے پر پہنچنے کے بعد ہم کو لازم ہے کہ ہندوؤں کے مندرجہ ذیل ذخیرہ پر نظر ڈالیں اور ان سے جدید تعلیمات حاصل کریں:-

(۱) رامائن (۲) مہابھارت (۳) ہندو عہد حکومت کی تاریخ

(۴) ہندو افسانے، مثلاً شکنتلا، نلدن - وکرم اروسی وغیرہ (۵) ہندو دیومالا

(۶) ہندو رسوم - (۷) ہندو فرقوں کے حالات و خیالات

اس کے علاوہ اسلامی ذخیرہ سے پیشتر کی نسبت زیادہ کام لینا چاہیے اور اس کے لئے ذیل کے ذخیرہ پر نظر ڈالنی اور اس سے تعلیمیں اخذ کرنی چاہئیں:-

(۱) قرآن مجید (۲) احادیث (۳) اسلام کی عام تاریخ

(۴) اسلامی عہد حکومت ہند کی تاریخ

(۵) مثنوی مولانا رومؒ

(۶) الف لیلہ

(۷) شاہنامہ فردوسی

(۸) اردو زبان کے مشہور قصبے، مثلاً مولاناذیر احمد کے تصنیف کردہ قصبے - بوستان خیال - داستان امیر حمزہ

چار درویش - آرائش محفل یعنی قصبہ عاتم طائی - فسانہ عجائب - بدر منیر وغیرہ

(۹) اسلامی تصوف کی کتابیں

ہندو اور اسلامی ذخیرہ کے علاوہ ذیل کے مواد سے بھی تمیخیں مل سکتی ہیں :-

(۱) عیسائیوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۲) انگریزوں کی عام تاریخ

(۳) انگریزوں کی عہد حکومت ہند کی تاریخ

(۴) سکھوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۵) پارسیوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۶) بودھ مت والوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۷) راجپوتوں کی تاریخ

(۸) مرہٹوں کی تاریخ

جدید تلمیحات کی مثالیں | یہاں ہم مثال کے طور پر چند نئی تلمیحات کا ذکر کرتے ہیں جو عام ذخیرہ سے لی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ذیل کی تلمیحات پر غور کرو :-

کال کوٹھری یا بلیک ہول - (انگریزی عہد حکومت ہند کی تاریخ سے) پادشاہ گرد اسلامی عہد حکومت ہند کی تاریخ سے) الدین کاچراغ (الف لیلہ سے) تسمہ پا (الف لیلہ سے) کالی موت (یورپ کی عام تاریخ سے) چالیس ٹمگ (الف لیلہ سے) مکمل تسمہ! بندہ تسمہ! (الف لیلہ سے) حمام باد گرد (قصبہ عاتم طائی سے)۔

خوجی (فسانہ آزاد سے) ظاہر داریگ (توبہ النصوح سے) فطرت (توبہ النصوح سے) کلیم (توبہ النصوح سے) ربود لاماہ (اسلامی تاریخ سے) رستم یک دست (شاہ نامہ فردوسی سے) رشک حمار (خدائی فوج دار سے) خواجہ سنگ پرست (چار درویش سے) دیو سفید (شاہ نامہ فردوسی سے) گلابو (خدائی فوج دار سے) دیوانی پارکینٹ (انگریزوں کی عام تاریخ سے) پگوڈا (بودھ مت والوں کے مذہب) جمیل نقا (راجپوتوں کی تاریخ سے) عشائے ربانی (عیسائیوں کے مذہب) نوشابہ (سکندر نامہ سے) جانِ عالم کا طوطا (فسانہ عجائب) کل کا گھوڑا (بدر مینر سے) نرودان (بودھ مت والوں کے مذہب) دجنہ (پارسیوں کے مذہب) امرت - (سکھوں کے مذہب) کرپان (سکھوں کے مذہب) زنبار (پارسیوں کے مذہب) مہ آباد (پارسیوں کی تاریخ سے) ہنام (پارسیوں کے مذہب) خوجی کی فردی (فسانہ آزاد سے) رستم و اسفندیار کی سرزمین سے ایران مراد ہے۔ طلوع آفتاب کی سرزمین سے جاپان مراد ہے۔ آسمانی سلطنت سے چین کی سلطنت مراد لو۔ فراعنہ کی سرزمین سے مصر کا ملک مراد ہے۔ دیوتاؤں کی سرزمین سے ہندوستان سمجھو۔ روحانیت کی سرزمین ایشیا۔ مادیت کا گھوارہ، یورپ۔ کروڑ پتیوں کا ملک، امریکہ عہدِ ظلمت (یورپ کی تاریخ سے) عہدِ اصلاح (یورپ کی تاریخ سے) تاریک بڑا عظم سے افریقہ مراد ہے۔

ہندو ادبیات کی تلمیحات | نئی تلمیحات کی جو مثالیں ہم نے دی ہیں وہ بہت ہی کم ہیں۔ اگر ہم عام ذخیرہ کو سامنے رکھ کر تلاش کریں، تو بلاشبہ بہت سی نئی تلمیحات میں گی؛ لگے ہم اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان تلمیحات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو ہندو ادبیات سے لی جاسکتی ہیں اور جن سے ہمارے ادب کے قالب میں نئی روح پیدا ہو سکتی ہے اور جن کے اضافہ کے بعد ہم اپنی زبان اور ادب کو دونوں قوموں کا مشترک سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کی تلمیحات پر غور کی نظر ڈالو اور دیکھو کہ شاعری اور انشا پردازی میں ان سے کیا کام لیا جاسکتا ہے اور کون سے خیالات ان سانچوں میں ڈھالے جاسکتے ہیں :-

ساتویں راجہ اشوتپتی کی لڑکی مٹی۔ وہ اپنے شوہر ستیان پر دل سے فریفتہ تھی؛ شادی کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہیگا۔ موت کے وقت اس نے فرشتہ موت یم سے اس قدر التجائیں کیں اور اس قدر اصرار کیا کہ وہ ستیان کی روح قبض کرنے سے باز رہا۔

تیم مردوں کی روحوں کا دیوتا ہے۔ اس کا رنگ سبز ہے۔ پوشاک سرخ ہے۔ ایک ہاتھ میں بھالا، دوسرے ہاتھ میں بھینسی کی رسی ہے۔ ایک بھینسے پر سوار رہتا ہے۔ تیم پوری دہ مقام ہے جہاں وہ رہتا ہے۔ کالی چچی اُس کے محل کا نام ہے۔ اُس کے ملازم تیم دوت کہلاتے ہیں۔ جب کوئی مرتا ہے، تو تیم دوت اُس کے روح کو لا حاضر کرتے ہیں۔ اُس کی نیکیوں اور بدیوں کا دفتر کھولا جاتا ہے۔ پھر آخری حکم اُس کی نسبت صادر کیا جاتا ہے کہ وہ پتھروں میں داخل ہو، یا دوزخ میں جائے، یا دنیا میں کسی اور صورت میں جنم لے۔ دوزخ ناک کہتے اُس کی گزرگاہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کی چار آنکھیں ہیں۔ نتھتے کشادہ ہیں وہ تیم کی طرف سے موت کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

نشت روپا سب سے پہلی عورت ہے، جو دنیا میں پیدا ہوئی۔ جیسے مسلمانوں کے نزدیک خواہ کتے ہیں کہ برہمنی نے اپنے جسم کے دو حصے کئے ایک حصے سے ایک مرد بنایا، جس کا نام وراج ہے۔ دوسرے حصے سے عورت اور وہ یہی نشت روپا ہے۔

شکنتلا راجہ بھرت کی والدہ کا نام ہے۔ یہ وہی بھرت ہے جس کے نام سے ہندوستان کا نام بھارت ورش ہوا اور جس کی اولاد جنگ مہا بھارت میں معرکہ آرا ہوئی۔ یہ نامور رشی و شوا متری لڑکی تھی؛ مگر رشی کنو نے اُس کی پرورش کی اور اب اُسی کی بیٹی کہلاتی ہے۔ جب یہ جوان ہوئی، تو اتفاق سے راجہ دوش نیت سیرنگا کی تقریب سے رشی کنو کے آشرم کے قریب جا نکلا اور اُس کو دیکھ کر فرفتہ ہو گیا۔ شکنتلا نے اُس کے ساتھ شادی کر لی؛ مگر اُس کے ساتھ نہیں گئی۔ چلتے وقت راجہ نے اپنی ایک انگشتری بطور محبت کی یادگار کے اُس کو دی۔ اچھ کے جانے کے بعد شکنتلا اُس کی محبت میں از خود رفتہ رہنے لگی۔ ایک دن ایک رشی اُس رشی سے ملنے کے لئے آیا، جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ شکنتلا نے عاشقانہ بے خودی کے عالم میں رشی مذکور کی تنظیم نہیں کی۔ اُس نے بد عادی کہ تیرا شوہر تجھے بھول جائیگا۔ شکنتلا نے نادم ہو کر معافی مانگی۔ رشی مذکور نے اپنی بد عادی اس قدر ترمیم کی کہ جب راجہ دوش نیت اپنی انگشتری دیکھیا، تو اُس کے دل میں تیری یاد تازہ ہو جائیگی۔ شکنتلا جب حاملہ ہوئی، تو اپنے خاوند کے پاس جانے لگی۔ رستے میں وہ ایک چشمے میں نہانے کے لئے اُتری اتفاق سے انگشتری اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور چشمے میں گر پڑی۔ مگر اُس کو خبر نہیں ہوئی۔ جب راجہ کے پاس پہنچی، تو اُس نے نہیں پہچانا۔ مجبوراً اُس کی والدہ اُسے جھگل میں واپس لے آئی۔ یہاں اُس کے بطن سے بھرت پیدا ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد

ایک ماہی گیر اُس چشمے کے کنارے پہنچا، جہاں شکستہ لال نے غل کیا تھا۔ ایک مچھلی اُس کے جال میں آئی۔ جب اُس کا پیٹ چاک کیا، تو اُس میں سے ایک انگشتری نکلی۔ ماہی گیر وہ انگشتری راجہ دوش نہت کے پاس لے گیا۔ راجہ نے اپنی انگشتری کو پہچانا۔ فوراً اُس کے دل میں شکستہ لال کی یاد تازہ ہوئی۔ اُس نے جھگل سے اُس کو اُد اُس کے لڑکے بھرت کو اپنے پاس بلایا۔

ارجن راجہ پانڈو کا لڑکا رانی کنتی کے بطن سے تھا۔ اُس کی بہادری، سپہ گری، اور تیر اندازی کی ہمتیں مشہور ہیں۔ وہ اپنے تیروں سے بارش اور ہوا کو روک دیتا تھا اور اگر چاہتا، تو اُن سے آگ اور پانی برساتا تھا۔ جنگ کے وقت وہ کبھی بلند قامت نظر آتا تھا، کبھی پست قد، کبھی لاغر دکھائی دیتا تھا اور کبھی فربہ، درودپی کے سویمبر میں بہت سے شاہزائے اور بہادر آدمی حاضر تھے؛ مگر درودپی کو اُس کے سوا کوئی حاصل نہ کر سکا۔ اگنی نرپا نے اُس کو اپنی کمان عطا کی تھی۔ شیوجی نے اپنا طاقتور ہتھیار شہوت دیا تھا۔ کوئیر، ورن اور یم دیوتاؤں نے بھی اُسے خاص اسلحہ عنایت کیے تھے۔ اندر دیوتا نے ایک سنگھ دیا تھا۔ پھونکنے کے وقت اس سے بادل کی گرج پیدا ہوتی تھی۔ مہا بھارت کی جنگ میں اُس نے کوردو کل ناطقہ بند کر دیا اور بہادری و دلیری کے بڑے بڑے کارنامے دکھائے۔ ایک عہد شکنی کے سبب اُسے بارہ برس تک جلاوطن رہنا پڑا۔ جب اچھیاہشتر نے ایک گھوڑا اس غرض سے چھوڑا کہ وہ تمام ہندوستان میں ہر راجہ کی عکدار سے گزے اور تمام راجہ یہ مان کر کہ راجہ یمہشتر سب سے بڑا راجہ ہے، اس گھوڑے کو گرفتار نہ کریں، تو ارجن فرج کثیر لے کر اُس گھوڑے کے پیچھے چلا، تاکہ اگر کوئی اچھیاہشتر کے دعوے کو رد کرے اور گھوڑے کو گرفتار کرنا چاہے، تو اُس سے جنگ کرے۔ چنانچہ بہت سے راجاؤں سے ارجن لڑا اور گھوڑے کو بے حفاظت تمام واپس لایا۔ گویا اُس کی بہادری کے سبب اچھیاہشتر چکر دیتی راجہ مان لیا گیا۔ سری کرشن جی مہا بھارت کی جنگ میں ارجن کے رتھ بان تھے۔ اردو زبان کے قدیم شاعروں نے ارجن کی تیر اندازی اور کمان داری کا ذکر تمیحا کیا ہے۔

سدیومن کا ذکر پرتوں میں آتا ہے۔ لکھا ہے کہ منودئی دوست کو بڑی آرزو تھی کہ اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اس خیال سے اُس نے ورن اور برتر دیوتاؤں کے نام پر ایک یگ کیا؛ مگر یگ کے انتظام میں کچھ غلطی واقع ہوئی۔ اس لیے لڑکے کی جگہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام رلار لکھا گیا۔ منودئی دوست نے جب بت

اتجائی، تو دیوتاؤں نے رلا کو لڑکے کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اب اس کا نام سد یوین ہوا۔ جوان ہونے پر سد یوین سیر و شکار کی غرض سے اتفاقاً اُس جنگل میں جا نکلا، جس کو شیوجی نے بد عادی تھی۔ بد دعا کے اثر سے اس جنگل کا یہ خاصہ ہو گیا تھا کہ اگر کوئی مرد وہاں قدم رکھتا تھا، تو عورت بن جاتا تھا۔ چنانچہ سد یوین اُس جنگل میں پہنچے ہی پھر عورت ہو گیا۔ اس کے بعد شیوجی کی عنایت سے یہ بات حاصل ہو گئی کہ وہ ایک مینے مرد رہتا تھا اور ایک مینے عورت۔ دونوں حالتوں یعنی مردانی اور زنانی حالت میں اس سے اولاد ہوئی۔

اروٹشی بہشت کی ایک اسپد یعنی حور تھی۔ ورن اور مترو دیوتاؤں نے اُس کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر بد عادی تھی۔ اس سبب وہ زمین پر پھینکی گئی۔ یہاں راجہ تو پر وجود گرم کے نام سے مشہور ہے، اُس پر فریقہ ہوا۔ اُس نے چند شرائط کے ساتھ راجہ کی بیوی بن کر رہنا منظور کیا۔ اُن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ بجز خاص وقت کے میرے سامنے کبھی برہنہ نہ ہونا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دو منڈے جن کو میں عزیز رکھتی ہوں، میرے بستر کے قریب بندھے رہیں اور تمہیں اُن کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ کچھ عرصے کے بعد راجہ اندر نے چاہا کہ اروٹشی بہشت میں اُس بلائی جائے۔ جو جاسوس اُس کام کے لئے مامور ہوئے تھے، انہوں نے اندھیری رات میں اکر دونوں منڈے چرائیے۔ اروٹشی نے غل مچپایا، تو راجہ برہنگی ہی کی حالت میں تلوار ہاتھ میں لے کر چوروں کے تعاقب میں نکلا۔ راجہ اندر کے جاسوسوں نے عین اُس وقت بجلی چمکائی، جس کے سبب راجہ کا برہنہ جسم اروٹشی کو نظر آیا۔ عہد ٹوٹ گیا۔ وہ راجہ کی نظر سے فوراً غائب ہو گئی اور بہشت میں پہنچی و گرم اُس کے فراق میں سخت ملول رہتا تھا اور آدراہ پھرنے لگا۔ اتفاقاً اُس نے کرکشیتر کے تالاب میں اروٹشی کو اپنی چار سیلیوں کے ساتھ نہاتے دیکھا۔ اُس وقت اُس نے راجہ سے کہا کہ میں حاملہ ہوں۔ ایک سال گزرنے پر تمہارے پاس آؤ گی اور صرف ایک ات ٹھیر ونگی۔ چنانچہ مدت مذکور گزرنے پر وہ راجہ کے پاس آئی۔ لڑکا جو اُس کے بطن سے پیدا ہوا تھا، راجہ کے حوالے کیا۔ رات بھر ٹھیر کر دیا چلی گئی۔ آخر میں دیوتاؤں کے مشورہ سے راجہ نے ایک بیگ کیا اور اُس کے صلہ میں اروٹشی کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ اروٹشی اور و گرم کی محبت کا فائدہ ملک الشعرا کا لید اس نے نہایت فصاحت سے اپنے ایک نامک میں بیان کیا ہے۔

سور یہ سورج سے مراد ہے۔ یہ بھی ایک دیوتا ہے۔ اس کے بہت سے القاب ہیں مثلاً روشن۔ دن کا مالک

چشمِ عالم - سُہری کرنوں والا وغیرہ اُس کے رتھ کے آگے سات گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ اُس کا قد کوتاہ، کھٹس سُرخ اور رنگ تانبے کا سا ہے۔ اس کی بیوی کام سنجہا ہے۔ جو دُشوگر ماکھی لڑکی تھی۔ سنجہا اُس کے جلوہ کی تاب نہ لا کر اُس سے جدا ہو گئی تھی؛ مگر دُشوگر ماکھی نے سُور یہ کو خرا د پر چڑھا کر پاؤں کے سوا ہر طرف سے پھیل ڈالا، جس سے اُس کی روشنی کا آٹھواں حصہ کم ہو گیا۔ پھر سنجہا اُس کے ساتھ پہننے لگی سو بچ فبی را جا سُور یہ ہی کے نسل سے ہیں۔

سوم چاند کو کہتے ہیں۔ یہ بھی دیوتا ہے۔ نباتات کا پرورش کرنے والا اور عابدوں کا گہبان کہلاتا ہے۔ اس نے وکش کی ستائیں لڑکیوں سے بیاہ کیا۔ یہی لڑکیاں ہیں جنہیں پختہ یعنی چاند کی منزلیں کہتے ہیں۔ چندر بھیسوں کا سلسلہ سوم ہی سے چلا ہے۔ جس تھ پر وہ سوار ہوتا ہے، اُس کے تین پتے ہیں۔ سفید رنگ کے دس گھوڑے اس رتھ کو کھینچتے ہیں۔ اس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً ٹھنڈی کرنوں والا۔ سفید کرنوں والا۔ ستاروں کا مالک۔ رات کا روشن کرنے والا وغیرہ۔

کام جے کام دیو بھی کہتے ہیں، عشق کا دیوتا ہے۔ جب خدا نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے۔ اُس وقت کام خود بخود اُس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ بہشت کی حوروں اور آسمانی پریوں کا مالک ہے۔ تیرکان اس کے ہتیار ہیں۔ تیروں میں رنگ ہر رنگ کے پھول لگے ہیں۔ وہ ایک حسین نوجوان ہے۔ طوطے پر سوار ہے۔ اس کے جلوہ میں حوروں اور پریوں کے جھگٹ ہیں۔ ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک علم ہے، جس کے پھریرے پر مچھلی کا نشان ہے۔ اس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً حسین۔ شعلہ زن۔ شادماں۔ شوخ و شنگ۔ سراپا خرمی۔ مردم فریب۔ شمع ہار۔ چٹخا انگارہ۔ عصائے قمر۔ حسن کا ہتیار۔ صلح شکن۔ عیاش۔ دنیا کا اتالیق۔ کانِ محبت۔ پھولوں سے مسلح۔

پچھی یا کشتی دولت کی دیوی ہے۔ دیوتاؤں اور اُسروں نے سمندر کو بلو یا تھا، تو اور رتنوں کے ساتھ پچھی بھی سمندر سے کنول کا پھول ہاتھ میں لیے نکلی تھی۔ جب سری رام چندر جی نے اوتار لیا، تو یہ سیتا جی کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ سری کرشن جی کے زمانے میں اُس نے رنگنی کا قالب اختیار کیا۔ دولت و حُمت کی دیوی ہونے کے سبب ہر جگہ اس کے پرستش کی جاتی ہے۔ اس کو ہیرا، اندرا، اور چھپلا بھی کہتے ہیں۔

اگنی قدیم زمانہ کا دیوتا۔ اس کی تین شکلیں ہیں۔ آسمان پر سورج ہوا پر بجلی۔ زمین پر آگ۔ اس کی سات بیویاں ہیں۔ ہون کے وقت آگ میں جو گئی دالا جاتا ہے، یہ ان زبانوں سے اُس گئی کو چاتا ہے۔ اس کی پوشاک سیاہ رنگ کی ہے۔ سر پر دھوئیں کا تلج ہے۔ ایک دشن ہتھیار اُس کے ہاتھ میں ہے۔ سات ہوائیں اُس کے رتھ کے پیٹے ہیں۔ سرخ رنگ کی گھوڑی اُس کے رتھ میں جوتی جاتی ہے۔ ایک منڈھا اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دیوتا اُس پر سوار ہوتا ہے۔

اندر آسمان، ہوا، بادل، بہشت اور حوروں کا مالک ہے۔ اس کا درجہ سب دیوتاؤں سے بڑا ہے۔ اگنی کی طرح دیدوں کی بہت سی رچائیں اُس کی طرف ہی منسوب ہیں۔ اس کا رنگ لال کنڈن جیسا ہے۔ بازو لمبے لمبے ہیں، اپنی مرضی سے جو شکل چاہے، اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کی سواری کا رتھ چمکیلا ہے۔ دوسرے رنگ کے گھوڑے اُس میں جوتے جاتے ہیں۔ اس کا خاص ہتھیار دھج ہے۔ کمان اور جال بھی ساتھ رکھتا ہے۔ چونکہ وہ ہواؤں کا مالک ہے۔ اس لڑی موسموں کا انتظام اور بارش کا اہتمام اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ برق اور رد کو مناسب موقعوں پر مامور کرتا ہے۔ بارش برساتا ہے۔ بجلی چمکتا ہے۔ زمینوں کو سرسبز کرتا ہے۔ بجلی اور طوفان پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے بدن پر ہزار آنکھوں کے نشان ہیں۔ رادون والی لٹکا کا بیٹا میگھ ناو اُس کو گرفتار کر کے لٹکا لے گیا تھا۔ اسی سبب سے میگھ ناو کو اندر جیت کہتے ہیں۔ دیوتا اُسے لٹکا سے چھڑا کر لٹاے وہ رشیوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے اُن کے پاس بہشت کی حوروں کو بھیجتا رہتا ہے۔ بھج کے باشندے پہلے اندر کی پرستش کیا کرتے تھے۔ سری کرشن جی نے اُن کو اندر کی پرستش سے منع کیا۔ اندر نے ناراض ہو کر اُن کی سزا کے لئے بارش کا طوفان بھیجا۔ سری کرشن جی کو بردھمن پہاڑ کو اپنی ایک اگلی پر لے کر کھڑے ہو گئے۔ تمام بھج باشی اس پہاڑ کے نیچے آ گئے۔ اور اُن کو طوفان سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہے، جس کا نام ارادت ہے۔ اس کے کئی صفاتی نام ہیں۔ مثلاً

دجر دالا، دیوتاؤں کا سردار، ہوا کا مالک، بہشت کا مالک، اس کے دار الحکومت کا نام امرادوتی اور اس کے رتھ کا نام دمان ہے۔

مہادیوی، یا پاربتی، شوجی کی بیوی کو کہتے ہیں۔ مختلف صفات و افعال کے لحاظ سے اس کو مختلف

نام ہیں۔ مہربانی کی حالت میں وہ حسب ذیل ناموں سے پکاری جاتی ہے:-

مادر دینا، زرد فام اور درخشاں، ہر دم نشا و ماں۔ متوالی آنکھوں والی، مگر جب غضب ناک ہوتی ہے تو حسب ذیل ناموں سے پکاری جاتی ہے:-

دُرگا، کالی، خوف ناک، غضب ناک، لالہ امنوں والی، اُس کے دہل ہاتھ ہیں۔ ہر ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے۔ اُس کا رنگ سر دہی۔ حسن و جمال اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ عام حالت ہے، مگر غصے کی حالت میں اُس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ ہاتھوں اور داٹوں سے خون ٹپکتا ہے۔ سانپ اُس کے جسم کو حلقہ کیے ہوتے ہیں۔ گلے میں سرود اور گھوڑیوں کی مالا ہوتی ہے۔ اُس کی پرستش اسی حالت میں کی جاتی ہے۔ اس کی مورتی کے سامنے خون کبھی خشک ہونے نہیں پاتا۔

اہر آون پاتال کا راجہ تھا۔ لنگا کی لڑائی میں جب میگھ ناد اور کھکرن مارے جا چکے، تو رادون نے اس سے رد طلب کی۔ وہ بھوشن کے لباس میں سری رام چندر جی کے لشکر میں داخل ہو گیا۔ کسی نے اُس کو نہیں پہچانا۔ سری رام چندر جی اور بھیم جی دونوں اُس وقت سو رہے تھے۔ وہ دونوں کو غفلت کی حالت میں اٹھائے گیا۔ پاتال پہنچ کر اُس نے چاہا کہ اپنے دیوتا کے سامنے دونوں کو فوج کرے، ہنومان جی کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو فوراً پاتال میں گئے۔ وہاں گیگ ہونے کو تھا۔ تمام سامان فرامس کر لیا گیا تھا۔ ہنومان جی گیگ کا سارا سامان کھا گئے۔ اہر آون کو قتل کیا اور دونوں بھائیوں کو واپس لشکر میں لائے برہما، مخلوق کو پیدا کرنے والا دیوتا۔ رنگ سرخ ہے۔ چار سر اور چار منوہ ہیں۔ چار ہاتھ اور آٹھ کان ہیں۔ ایک ہاتھ میں تلوار، ایک میں کمان، ایک میں مالا اور ایک میں دید ہیں۔ برہما جی کی سواری ہنس ہے۔ یہ دشنوجی کی ناف سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا ایک دن دو ارب سولہ کروڑ سال کے برابر ہے۔

بلرام، سری کرشن جی کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کا رنگ گورا تھا اور سری کرشن جی کا سونلا۔ دونوں دشنوجی کے اوتار ہیں، جنہوں نے سفید اور سیاہ رنگ میں ظہور کیا ہے۔ مرتے وقت اُس کے منوہ سے ایک سانپ نکلتا تھا! اس نے اُن کو شیش ناگ کا اوتار بھی کہتے ہیں۔ بلرام جی شراب پیا کرتے تھے۔ سری کرشن جی پر ہیز گارتے۔ بلرام جی نہایت تند مزاج تھے، مگر سری کرشن جی نرم طبیعت رکھتے تھے۔ بلرام جی کے ہتھیار

ہل اور مہل ہیں۔

رام یعنی سری رام چندر جی، راجہ جہرت کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ راجہ جنگ کی بیٹی سیتا سے ان کی شادی ہوئی۔ راجہ جنگ نے جب سویمبر کا جلسہ منعقد کیا، تو شرط یہ کی کہ جو بہادر آدمی میری کمان کو خم کر دے گا، سیتا کی شادی اُسی سے کر دی جائیگی۔ یہ کمان راجہ کو رکودشمنوں نے عطا کی تھی۔ سری رام چندر جی اس کمان کے تین ٹکڑے کر ڈالے اور سویمبر کی شرط کو پورا کر دیا۔ شادی کے بعد راجہ جہرت نے سری رام چندر جی کو تخت پر بٹھانا چاہا، مگر جہرت کی والدہ رانی کی کئی نے ایک باندی کے بہکانے سے راجہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ جہرت کو تخت پر بٹھائے۔ اور رام چندر جی چودہ برس تک جلاوطن رہیں۔ سری رام چندر جی نے باپ کا کنا منظور کیا۔ پچھن جی اور سیتا کو ساتھ لے کر جنگل کو روانہ ہوئے۔ ان کی روانگی کے بعد راجہ جہرت کا انتقال ہو گیا۔ جہرت نے چتر کوٹ پہنچ کر سری رام چندر جی کو واپس چلنے اور تخت نشین ہونے کی صلح دی؛ مگر انہوں نے یہ بات منظور نہیں کی۔ مجبوراً جہرت ان کی کھڑاؤں لے گیا اور ان کو تخت پر رکھ کر خود بطور نائب سلطنت کے راج کرنے لگا۔ ریاسے گرد اور سی کے کنا سے بیج دٹی میں اونٹنی لٹکا کی بہن سری رام چندر جی پر عاشق ہو گئی۔ بہت چاہا کہ ان کو اپنی طرف مائل کرے؛ مگر کچھ اثر نہیں ہوا۔ پچھن جی نے اس گستاخی پر اس کے کان اور ناک کاٹ ڈالے۔ وہ روتی پیتی اپنے بھائی کے پاس پہنچی۔ نیز اس نے سیتا جی کے حسن جمال کی تعریف اس قدر کی کہ راؤن ان کے بھگالینے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ مین اُس وقت جب کہ سری رام چندر جی اور پچھن جی شکار کو گئے ہوئے تھے راؤن آیا اور سیتا جی کو جبر سے اپنے ساتھ لے گیا۔ دونوں بھائی جب شکار سے واپس آئے، تو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ راجہ سگدیو جوان اطراف میں حکمران تھا، اُس نے اور اُس کے خبر لہنومان نے لٹکا پر چڑھائی کرنے میں مدد دی۔ ہنومان سمندر پہنچا کہ لٹکا پہنچا اور سیتا جی کی خبر لایا۔ پھر سمندر پر پل باندھا گیا بندروں اور ریچھوں کی فوج ہنومان کی سرکردگی میں لٹکا پہنچی۔ راؤن کے ساتھ جنگ کی گئی۔ راؤن کے بیٹے اور اُس کا بھائی اور خود راؤن اس لڑائی میں قتل ہوا۔ لٹکا فتح ہوئی اور سیتا جی نے قید سے رہائی پائی۔

راؤن والی لٹکا نہایت شریہ ظالم اور بدی کا پہلا تھا۔ اُس کے دس سرتے۔ میں ہاتھ تھے۔ انکھیں سنچ

تھیں۔ صورت خوف ناک تھی۔ اس میں اس قدر طاقت تھی کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا تھا۔ سمندر کو متحرک کر سکتا تھا۔ دیوتاؤں کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔ اگنی دیوتا باورچی کا کام کرتا تھا۔ ورن دیوتا پانی بہم پہنچاتا تھا۔ کویر دیوتا دولت دیتا کرتا تھا۔ وایو دیوتا اُس کے محلات میں جھاڑو دیتا تھا۔ لنگا جس میں وہ حکومت کرتا تھا، اُس کے تمام مکانات سونے سے معرق تھے اور جگ جگ جگ کر رہے تھے۔

کو آئینہ رانوں کا دیوتا ہے۔ کوہ ہمالیہ پر ایک شہر لگا ہے، جہاں اُس کا قیام ہے، سونا چاندی اور جواہرات سب اُس کے قبضے میں ہیں۔ اس کا رنگ سفید ہے۔ اس کے تین پاؤں ہیں۔ آٹھ دانت ہیں۔ سارا جسم زیور سے ڈھکا ہے۔ اُس کو دھن تپتی یعنی دولت کا مالک اور رتن تپتی یعنی جواہرات کا مالک کہتے ہیں۔ وایو ہوا دل کا دیوتا ہے۔ اندر دیوتا کا رفیق ہے۔ اکثر اُس کے ساتھ ایک ہی رتھ پر سوار ہوتا ہے۔ خود اُس کا رتھ طلائی ہے جس میں ہزار گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ خوشبو یوں کا حامل اور ایم رواں اُس کے صفاتی نام ہیں۔

ورن سمندروں اور دریاؤں کا دیوتا ہے۔ اس کا صفاتی نام جل پتی ہے اُس کی سواری کا جانور مگر مچھ ہے۔

سرسستی علم، عقل اور شاعری کی دیوی ہے۔ رنگ سفید ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے۔ سفید کنول کے پھول پر جلوہ افروز ہے، برہما جی اس کے شوہر ہیں۔

کورم اوتار۔ اس اوتار کی شکل کچھوے جیسی ہے۔ ایک دفعہ دیوتاؤں کے مقابلے میں دیتوں نے غلبہ پایا۔ اندر کی حکومت میں بھی خلل آگیا۔ برہما جی اور ناراین جی کی ہدایت سے دیوتاؤں نے مشورہ کیا کہ سمندر کو بڑا کر اس میں سے امرت یعنی آبِ حیات نکالیں اور اُس کو نوش کر کے دیتوں کا مقابلہ کریں اور ان کو مار کر آرام کی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ سمندر کے بلونے کے لئے کوہ بندھیا چل کی رٹی بنائی گئی۔ شمش ناگ کی رتی بنا کر اُس کے گرد لپٹنی اور سمندر کو سب دیوتاؤں نے بلونا شروع کیا، مگر کوہ بندھیا چل اپنے وزن کے سبب سمندر میں ڈوبا جاتا تھا اور ایک مقام پر کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ کورم اوتار نے کچھوے کے روپ میں ظہور کیا۔ وہ سمندر میں اتر گیا اور کوہ بندھیا چل کو اپنی پشت پر جمایا۔ سمندر بلونے سے جھپیل

چودہ رتن برآمد ہوئے :-

- (۱) اُمرت یعنی آبِ حیات - اسے دیوتاؤں نے پی لیا۔
- (۲) دمنوتری طبیب - یہ ایک ہاتھ میں جونک اور ایک ہاتھ میں ہیلہ لے کر برآمد ہوا۔
- (۳) پچھی دیوی - یہ دشمنو جی کے حصّے میں آئی۔
- (۴) شراب - اسے دیتوں نے نوش کیا۔
- (۵) چاند - یہ شیوجی کے حصّے میں آیا۔
- (۶) رمبھا - یہ ایک حسین بستی حور تھی۔
- (۷) اچی شرود - یہ ایک اعلیٰ صفت گھوڑے کا نام ہے۔ اسے سور یہ نے لیا۔
- (۸) کوسنبہ منی - اسے دشمنو جی نے لیا۔
- (۹) پارچات جسے کلپ برکش بھی کہتے ہیں - یہ ایک بستی درخت تھا۔
- (۱۰) سُرتبی - یہ ایک اعلیٰ صفت گائے تھی، جو رشیوں کو دی گئی۔
- (۱۱) ارادت - یہ ایک نایاب ہاتھی تھا، جو اندر کے حصّے میں آیا۔
- (۱۲) سنکھ، جس کو پھونکنے سے بادل کی گرج پیدا ہوتی تھی - یہ دشمنو جی نے لیا۔
- (۱۳) کمان - یہ ایک عجیب کمان تھی۔
- (۱۴) روش -

مقیہ، اس کے معنی ہیں مچھلی۔ یہ ایک اوتار کا نام ہے۔ راجہ منوجس نے دولاکھ برسِ یا ست کی تھی، ایک دفعہ دریائے کرت مال میں اشنان کر رہا تھا۔ یکایک ایک خوب صورت مچھلی اُس کے ہاتھ آئی۔ جب اُسے ایک ات دن ہاتھ میں لیے رہا اور اُس کی خوب صورتی کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے ایک گھرے میں ڈالا، مگر وہ گھرے میں نہ سمائی۔ راجہ نے اُسے ایک کنوئیں میں ڈال دیا، مگر کنوئیں میں بھی سما سکی۔ کنوئیں سے نکال کر اُسے ایک تالاب میں پہنچایا۔ جب تالاب میں بھی اُس کی گنجائش نہ ہوئی، تو دریائے گنگا میں ڈالی گئی۔ یہاں بھی اُس نے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور سارے دریا میں نہ سما سکی۔ مجبوراً اُسے سمندر میں پہنچایا۔ یہاں پہنچ کر

وہ اس قدر پھیلی کہ تمام سمندر پر چھا گئی۔ اب اُسے سمجھا کہ یہ خدائی اسرار ہے۔ مچھلی نے راجہ سے کہا کہ ایک ہفتے کے بعد دریائے جلال منج زن ہوگا۔ طوفان کے سبب ساری دنیا پانی میں غرق ہو جائیگی۔ تم فلاں کشتی پر دوتاؤں کے ساتھ بیٹھ جانا اور کشتی کو میرے اس سینک سے جویشانی سے بچلا ہوا ہے، باندھ دینا۔ چنانچہ طوفان آیا اور ترہ لاکھ اٹھائیس ہزار برس تک رہا۔ تمام دنیا تباہ ہو گئی۔ صرف آسمان اور اُس کے ہمراہی محفوظ رہے۔ پھر آسمان کی نسل کو دنیا دوبارہ آباد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک سرکش دیت جس کا نام سنگھاسر تھا، دیدوں کو چرا کر سمندریاں چھپ گیا تھا۔ برہما جی کے فریاد کرنے پر یہ اوتار سمندر کی تہ میں پہنچا اور دیت مذکور کو ہلاک کر کے دیدوں کو واپس لایا۔

دامن اوتار، جس کو باؤن اوتار بھی کہتے ہیں۔ اس اوتار کے ظہور کا واقعہ برہمنوں نے اس طرح بیان کیا ہے :- دیتوں کا ایک راجہ تھا جسے راجہ جی کہتے۔ اُس نے تینوں لوک اپنے قبضے میں کر لیے تھے :- یوتاؤں کو شکست دے کر اُن کا ملک چھین لیا تھا :- یوتاؤں کی حمایت کے لیے یہ اوتار نمایاں ہوا۔ عین اُس وقت جبکہ راجہ جی یک کر رہا تھا، یہ اوتار اُس کے پاس پہنچا اور اُس سے تین قدم زمین کا سوال کیا۔ راجہ نے اس سوال کو حقیر سمجھ کر کہا۔ سوال میرے دے کے مطابق ہونا چاہیے :- آسمان نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔ راجہ نے اجازت دی کہ تین قدم ناپ کر زمین لے لے۔ دامن نے ایک قدم اوپر کے لوک پر رکھا :- دوسرے قدم سے درمیانی لوک کو ناپا۔ تیسرے قدم کے لیے کہا کہ ساری زمین میرے ایک قدم کے برابر ہے۔ راجہ نے اقرار پر ثابت قدم رہا اور اپنے تین اُس کے قدموں پر ڈال دیا۔ دامن جی نے خوش ہو کر پاتال کا ملک اُسے بخش دیا اور دیتوں کی صفات اُس سے دُور کر دیں۔

دراہ اوتار، اس اوتار کے ظہور کا سبب یہ ہے کہ ایک نہایت سرکش اور طاقتور دیت ہرناتش نامی زمین کو چرا کر سمندر میں پاتال تک کھینچ لے گیا تھا۔ برہما جی کی التجا پر اس اوتار نے نمایاں ہو کر برہما جی کی شکل اختیار کی۔ سمندر میں کود کر اپنے بڑے دانت پر زمین کو رکھ لیا اور سمندر سے کھینچ لایا۔ پھر ہرناتش سے جنگ ہوئی، جو ایک ہزار سال تک جاری رہی۔ آخر ہرناتش مارا گیا۔

نرسنگ اوتار، ہرناتش کا توام بانی ہرناتش جو بھی نہایت ظالم اور مغرور تھا۔ شیو جی کی عبادت

کرنے سے اُسے یہ عطیہ ملا کہ نہ کوئی انسان اُسے ہلاک کر سکیگا، نہ کوئی حیوان۔ اُس کی موت نہ دن کے وقت ہوگی، نہ رات کو۔ وہ نہ آسمان پر مارا جائے گا، نہ زمین پر۔ اپنی موت کی طرف سے مطمئن ہو کر اُس نے سرکشی غیثاً کی۔ دیوتاؤں سے لڑ کر اُن کا سارا ملک چھین لیا۔ اُس نے سارے ملک میں منادی کر دی کہ میری حکومت میں کوئی شخص نارائن کا نام نہ لے۔ اُس کا بیٹا ہیلاد خدا پرست تھا۔ اُس کو بہت سمجھایا کہ وہ خدا پرستی چھوڑ دے مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دفعہ ہیلاد کے قتل کا ارادہ کر کے اُس نے تلوار اٹھائی اور اُس سے کہا کہ اب دیکھوں تجھے میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے تلوار چمکائی کہ یکایک اُس کے قریب ایک ستون سے زرنسنگہ اوتار نمایاں ہوئے۔ ان کا اوپر کا جسم شیر کا اور نیچے کا جسم انسان کا تھا۔ انھوں نے ہرناکاشپو کو پکڑ کر اپنے زانو پر بٹھالیا اور پیچھے اور ناخنوں سے اُس کا پیٹ چرڈالا۔ اُس وقت شام کا وقت تھا۔ نہ دن تھا، نہ رات، اُس کی موت نہ آسمان پر ہوئی، نہ زمین پر اور نہ وہ کسی انسان کے ہاتھ سے مارا گیا، نہ حیوان کے ہاتھ سے۔ غرض کہ شیوجی کا کہنا ہر طرح پورا ہوا۔

پرت رام، یہ دشمنو جی کا چھٹا اوتار ہے۔ سری رام چندر جی ساتویں اوتار تھے۔ یہ چھتریوں کا دشمن اور برہمنوں کا دوست تھا۔ اُس نے اکیس دفعہ چھتریوں سے جنگ کی اور اُن کو قتل کیا۔ سبب یہ تھا کہ ایک چھتری راجہ جس کا نام کارت دیر یہ تھا اور جس کے ہزار ہا ہتھ تھے، ایک دفعہ اُس کے مکان پر آیا اور اُس کی غیبت میں اُس کی ایک اعلیٰ صفت گائے جس کا نام کام دھینو تھا، چرا کر لے گیا۔ پرت رام کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو اُس نے راجہ کا تعاقب کیا اور اس سے لڑ کر اُس کے ہزار ہا ہتھ کاٹ ڈالے اور اُسے قتل کر دیا۔ پھر غصے کی حالت میں بار بار چھتریوں سے جنگ کی اور پانچ جھیلیں اُن کے خون سے بھر دیں۔ پرت رام کے ہاتھ میں ہتیار کی جگہ ہمیشہ ایک کلہاڑی رہتی تھی۔

کرشن، یہ مشہور اوتار ہیں۔ والدہ کا نام دیو کی، والد کا نام واسد یو تھا۔ اُس زمانے میں متمدن کا فرمان دار راجہ کنس تھا، جو نہایت ظالم تھا، بنجیوں نے خبر دی تھی کہ دیو کی کا لڑکا تجھے قتل کر گیا۔ یناشن واسد یو اور دیو کی کو قید کر لیا۔ چنانچہ دیو کی کے کئی حمل کے لڑکے اُس نے مار ڈالے۔ آخری حمل میں سری کرشن جی ظاہر ہوئے، خدا کو منظور تھا کہ وہ اُس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ وہ عجیب طریقے سے محفوظ رہا۔

جوان ہونے پر بھی کنسن نے بہت تدبیریں کیں کہ اُن کو قتل کر ڈالے؛ مگر اُس کا بس نہیں چلا اور آخر کار وہ خود سری کرشن جی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اُن کے عجیب عجیب کارنامے مشہور ہیں۔ جنگ مہا بھارت میں وہ پانڈو کی طرف تھے اور اُن کی فوج کو رُدوں کی طرف سے لڑ رہی تھی۔ اٹھ رانیاں تھیں؛ مگر اُن کی محبوب لائق کا نام راودھا تھا۔

دشنوہر دفعہ دنیا کے ظہور سے پہلے دشنوجی، شیش ناگ کے بستر پر بیٹھے پانی پر تیرتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں اُن کا نام نارائن ہے۔ یعنی پانی پر تیرنے والا۔ اُن کی ناف کنول کے پھول سے مشابہہ ہے۔ بڑا جی انھیں کی ناف سے پیدا ہوئے۔ دشنوجی ان کی پیشانی سے برآمد ہوئے۔ دشنوجی نے مختلف صورتوں میں ظہور کیا ہے۔ ان صورتوں کو اوتار کہتے ہیں۔ نو اوتار ظاہر ہو چکے ہیں۔ یعنی قلیبیہ، کورم، وراہ، نرسنگھ، واسن، پرسرام، رام، کرشن، بدھ۔ نویں اوتار کا ظہور باقی ہے۔ اس آخری اوتار کو ہندو کلکی اوتار کہتے ہیں۔ گنگا دشنوجی کے پاؤں سے ظاہر ہوئی ہے۔ یہ دنیا کی حفاظت اور پرورش کرتے ہیں۔ ان کے ہزار نام ہیں۔ ان کی بیوی کا نام مچھی ہے۔ رنگت سانولی ہے۔ شکل حسین ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ پانچ ہتھیاروں سے مسلح رہتے ہیں۔ ان کی کمان کا نام شازنگ اور تلواری کا نام ندک ہے۔ ایک ہتھیار کا نام سدشن اور ایک کا نام گنوکھی ہے۔ چند صفاتی نام حسب ذیل ہیں:-

لانا، لا آنتھا، سانپ کے بستر والے، چار ہاتھ والے، گایوں کے محافظ، عنصروں کے مالک، پانی پر سونے والے، چھمی کے شوہر، پانچ ہتھیاروں سے مسلح، کنول جیسی ناف والے، زرد پوش، بہشت کے مالک وغیرہ۔

شیو، ان کو ماد یو بھی کہتے ہیں۔ یہ دشنوجی کے پیشانی سے ظاہر ہوئے۔ مختلف صفات کے سبب مختلف نام ہیں۔ تباہ اور فارت کرنے والی طاقت کے سبب ان کے نام ہیں ماکال، سراپا غضب، بال جٹاؤں والے، اس حالت میں اُن کی سواری کتا ہے۔ جسم پر سانپ پلٹے رہتے ہیں۔ شراب پی کر مست نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک نام بھوتیشور ہے۔ یعنی بھوتوں کے مالک، اس صفت کے سبب وہ قبرستانوں اور مسانوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ سر پر سانپوں کی جٹا گھلے میں کمپریوں کی مالا ہوتی ہے۔ بھوتوں کی فوج

ساتھ رہتی ہے۔ نبوت ان کے گرد مست ہو کر تیزی کے ساتھ ناپتے ہیں اور وہ خود بھی رقص کرتے ہیں۔ ان کے پانچ موٹھ ہیں۔ تین آنکھیں ہیں۔ تیسری آنکھ پیشانی کے درمیان ہے جس سے غصہ اور جلال ٹپکتا ہے۔ پیشانی کے گرد چاند حلقہ کئے ہیں۔ گلزار ہر نوش کرنے کے سبب نیلگوں نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں ترسول ہے۔ پوشاک ہرن، شیر، ہاتھی کی کھال ہوتی ہے۔ نندی بیل ان کے ساتھ رہتا ہے۔ بعض صفاتی نام حسبِ نیل ہیں:-
تین آنکھوں والا، نیلے گلے والا، چاند جیسے تاج والا، جٹاؤں والا وغیرہ۔

ہنومان، راجہ سکر یو کا جنرل جس نے سری رام چند رجبی کو لنکا کی جنگ میں مدد دی۔ اس کی شکل بندر جیسی ہے۔ اس کی خدمات دیوتاؤں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ہندوستان کے جنوبی کنارے سے پھانڈ کر لنکا پہنچتا ہے۔ سیتا جی کو سری رام چند رجبی کا پیغام پہنچاتا ہے۔ رادن کے باغ کو ویران کرتا ہے۔ جب لچھیوں نے اُس کی دم پر دوئی لپیٹ کر آگ لگا دی، تو وہ اپنی دم کی آگ سے تمام لنکا کو پھونک دیتا ہے۔ اُس کا رنگ نہ زرد سرخ دیکھتے سونے کی طرح درخشاں ہے۔ چہرہ لعل رمانی کی طرح نہایت سرخ ہے۔ قد مثل بلند مینار یا پہاڑ کے ہے۔ وہ بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ پہاڑ کو سر پر اٹھالیتا ہے۔ ہوا پر اڑتا ہے۔ بادلوں کو ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ سورج کو اپنے موٹھ میں چھپا لیتا ہے۔ آٹھائے جنگ میں وہ کوہ ہمالہ سے دو اڑیں لاتا ہے جس سے زخمی بند تندرست ہوتے ہیں۔ جب پچھن جی پر غشی طاری ہوتی ہے، تو وہ جیون بوٹی لاتا اور اُن کی غشی دور کر تا ہے۔ اُس کا صفاتی نام مرت پتر یعنی ہوا کا فرزند ہے۔ ہندوستان میں ہر جگہ اُس کی پرستش کی جاتی ہے۔

بھیشم، راجہ شانتو والی ہستنا پور کا بڑا لڑکا تھا۔ اُس کی ماں کا نام گنگا تھا۔ گنگا ایک عمدہ شکنی کے سبب راجہ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ راجہ نے ایک جوان اور حسین عورت سیتہ دتی سے شادی کرنی چاہی اُس کے والدین نے کہا کہ تمہارے بعد سیتہ دتی کی اولاد وارثِ تخت نہیں ہوگی؛ بلکہ یہ حق تمہارے بڑے بیٹے بھیشم کا ہے۔ اگر تم اقرار کرو کہ سیتہ دتی کی اولاد کو تخت دیا جائیگا، تو ہم اُس کی شادی کرنے پر انہی ہیں بھیشم کو جب یہ بات معلوم ہوئی، تو باپ کی آرزو پوری کرنے کے لئے اُس نے یہ اقرار کیا کہ نہ میں خود شادی کروں گا، نہ تخت لوں گا، اس اقرار پر سیتہ دتی سے راجہ کی شادی ہو گئی۔ اس شادی سے راجہ کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ راجہ کے مرنے کے بعد بھیشم نے بڑے لڑکے کو تخت پر بٹھایا؛ مگر وہ ایک جنگ میں مارا گیا۔

اُس نے اُس کے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر وہ بھی جوان اور لاولد مر گیا۔ بھیشم نے ستیہ وتی سے کہا کہ تم دیاسن جی کو بلا کر اپنے آخری بیٹے کی بیواؤں سے اولاد پیدا کراؤ۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ دلڑ کے اس طرح پیدا ہوئے۔ ایک نام پانڈو اور ایک کا نام دھرتراشٹر رکھا گیا۔ ان دونوں لڑکوں کی اولاد کو روں پانڈو کے نام سے موسوم ہوئی۔ جب دونوں میں اتفاق پیدا ہوا، تو وہ صلح کا مشورہ دیتا رہا؛ مگر کچھ اتر نہ ہوا۔ جنگ شروع ہوئی۔ بھیشم کو زن کا طرفدار تھا۔ اس کا مقابلہ ارجن سے ہوا۔ اُس کے تیروں سے اس کا سارا جسم چھد گیا۔ دوا نکل جگھ بھی زخموں سے خالی نہ رہی۔ جب وہ رتھ سے نیچے گرا، تو تیروں کو کھڑا کر کے اُس پر سلا یا گیا۔ زخم مُملک تھے؛ مگر اس حالت میں بھی وہ (۵۰) دن تک زندہ رہا اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتا رہا۔ تیروں کا بستر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بھیم پانڈو کا دوسرا شاہزادہ۔ یہ نہایت طاقتور، تدفین، بے رحم اور دراز قد تھا درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا تھا۔ طمانچہ مار کر ہاتھی کا مونہ پھیر دیتا تھا۔ گزر کی لڑائی اور کشتی میں بے فیطرت تھا۔ اس کی خوراک بت بھی جتنا کھانا اُس کے چار بھائی اور اُس کی والدہ کھاتی تھی، اتنا یہ اکیلا کھا جاتا تھا۔ دریودھن نے اُس کو حد سے زہر کھلایا تھا؛ یہ بچ نکل۔ جنگ مہابھارت میں اس نے بڑے بڑے کار نمایاں دکھائے؛ مگر دریودھن کے ساتھ قواعد جنگ کے خلاف فریب کی چال چلا۔ اس کا صفاتی نام دراز بازو ہے۔

جٹا یوگدوں کا پادشاہ تھا۔ جب آدن سیتاجی کو لنگائے جا رہا تھا، تو اُس نے رستے میں روکا؛ مگر آدن کے ہاتھ سے زخمی ہوا۔ سری رام چندر جی جب شکار سے واپس آئے اور سیتاجی کو تلاش کرنے لگے، تو اس نے پتہ بتایا اور سارا حال کہہ سنایا۔

روور طوفان اور ہواؤں کا دیوتا ہے۔ جو لوگ حیوانوں اور انسانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، اُن کے لئے یہ دیوتا مُملک اور اُن کے سوا اوروں پر مہربان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوتا برہما جی کی پیشانی سے پیدا ہوا۔ اس کا آدھا جسم عورتوں جیسا اور آدھا جسم مردوں جیسا ہے۔ جب برہما جی نے اُسے حکم دیا کہ وہ خلقت کو پیدا کرے، تو اُس نے موت اور راجھس پیدا کیے۔ یہ دیکھ کر برہما جی ناراض ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اس بیہودہ مخلوق کو نابود کر کے اچھی مخلوق پیدا کرو۔ اُس نے کہا۔ میں ایسی مخلوق پیدا کرنا نہیں چاہتا، جو زندگی اور موت کے پہنچے میں سیر۔ ایسی مخلوق آپ خود پیدا کریں۔

کھنکھرنے والوں کا بھائی تھا۔ اُس کی طاقت اور بھوک کا اندازہ لگانا محال ہے۔ وہ چھ مہینے سوتا اور ایک دن جاگتا تھا۔ راتوں نے اُس کو بیدار کرنا چاہا، تاکہ لڑائی میں مدد دے۔ بڑی مصیبت سے جاگا۔ شراب کے ہزار گھڑے بھائی سے لینے کیلئے اور اس اقرار پر آمادہ جنگ ہوا۔ ہزاروں بندر اُس نے کھا ڈالے۔ بندروں کے سوا کچھ کو کو گرفتار کر کے لٹکائیں لے گیا۔ آخر کا قتل ہوا۔

نیش ناگ سانپوں کا راجہ ہے۔ پتال کے ساتویں طبقے میں رہتا ہے۔ جب دنیا فنا ہوتی ہے، تو دشنو جی اُس کا اپنا بستر بنا کر پانی پر تیرتے ہیں اور یہ اپنے ہزار سرور سے اُن پر سایہ کرتا ہے۔ زمین اُسی پر ٹکی ہوئی ہے۔ جب وہ جائی لیتا ہے، تو گزرا آتا ہے۔ جب دنیا کے خاتمہ کا وقت آتا ہے، تو اپنی پھنکار سے اُگ نکالتا اور دنیا کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اُس کی پوشاک ارغوانی رنگ کی ہے۔ گلے میں سفید لٹا ہے۔ ایک ہاتھ میں ہل اور ایک ہاتھ میں موصل ہے۔ بلرام جی اسی کے ادا کرتے تھے۔ اِس کے محل کا نام منی منڈپ ہے۔

نیش عقل کا دیوتا ہے، مصیبتوں کا دور کرنے والا ہے، اسی لئے ہر کتاب اس کے نام سے شروع کی جاتی ہے۔ اِس کا جسم پہوتا اور موٹا ہے۔ رنگ زرد ہے۔ پیٹ بڑا ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ سر ہاتھی کا ہے، مگر دانت صرف ایک ہے۔ ایک ہاتھ میں سنکھ، دوسرے ہاتھ میں چکر، تیسرے ہاتھ میں گدا اور چوتھے ہاتھ میں کنول کا پھول ہے۔ اِس کی سواری کا جانور چوہا ہے۔ بعض صفاتی نام حسب ذیل ہیں:-

ایک دانت والا۔ فیل چہرہ۔ دراز گوش۔ کلاں شکم وغیرہ۔

ششی سور یہ کا لڑکا ہے اور ستاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رنگ سیاہ ہے۔ پوشاک بھی سیاہ رنگ کی ہے۔ اگر ششی اوپر کی طرف نگاہ کرے، تو تمام دنیا نیست و نابود ہو جائے، اُسی خیال سے وہ ہمیشہ سرنگوں رہتا ہے، تاکہ اُس کی نگاہ کسی پر نہ پڑے۔

مرت ہوا کے طوفانوں کے دیوتا ہیں۔ ان کی تعداد اُنچاس ہے۔ رعد و برق ان کے ہتھیار ہیں۔ آندھی

ان کی سواری ہے۔

دکش، برہما جی کا لڑکا ہے۔ برہما جی نے اسے پر جاتیوں کا سردار بنایا۔ اس خوشی میں اُس نے ایک یگ کا اہتمام کیا جس میں دیوتا اور رشی بلائے گئے، مگر شیوجی نہیں بلائے گئے۔ شیوجی کی بیوی اما یگ میں پہنچی، مگر اپنی

اور اپنے شوہر کی بے حرمتی دیکھ کر غیرت سے آگ میں جل گئی۔ دکش کوشیوجی سے عداوت تھی؛ اسی لئے ان کو مدعو نہیں کیا گیا۔ شیوجی اس واقعے کو سن کر غضب ناک ہوئے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چبانے لگے۔ سر سے بالوں کی ایک لٹ اکھاڑ کر پھینکی، جس سے ایک خوف ناک آواز نکلے۔ ساتھ ہی ایک ٹیپ صورت نمایاں ہوئی۔ جس کا نام دیرھبدر مشہور ہے۔ اس کے ہزار سر تھے۔ ہزار آنکھیں تھیں۔ ہزار پاؤں تھے۔ ہزار ہتھیرا اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس کی شکل خوں خوار اور خوف ناک اور دکھتی آگ کی طرح روشن تھی۔ سر پر ایک ہلال نمایاں تھا۔ شیر کی کھال جو خون سے آلودہ تھی، اس کے بدن میں تھی۔ شیوجی نے اس کو حکم دیا کہ وہ دکش کے یک کو خزا کر ڈالے۔ جب دیرھبدر اپنی لاتعداد فوج لے کر چلا، تو زمین لرزنے لگی۔ پہاڑ آپس میں ٹکرا گئے۔ ہوا شور و غل سے بھر گئی۔ سمندر میں تلاطم پیدا ہوا۔ اس نے یک کو خراب کیا۔ دیوتاؤں میں سے جو اس یک میں آئے تھے اندر کو زمین پر گر دیا۔ یم کو زرد کو بکھا۔ سرستی اور ماتری کی ناک کاٹ لی۔ متری کی آنکھیں نکال لیں۔ یوشن کے دانت حلق میں تار دیئے۔ اگنی کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ بھارگو کی داڑھی نوڈ دی۔ چاند کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ برہمنوں پر پتھر پھینکے۔ دکش کا سر کاٹ کر آگ میں جھونک دیا۔ یہ حالت دیکھ کر دیوتاؤں نے معافی مانگی اور التجا میں کہیں۔ آخر کار ان کی خطا معاف کی گئی اور ان کے اعضا پھر درست کر دیئے گئے۔

منودہ ہیں جن سے نسل انسانی چلتی ہے۔ یہ تعداد میں چودہ ہیں۔ پہلا منوسوایم بھوتھا۔ برہما جی نے اپنے جسم کے دو حصے کیے۔ ان سے ایک مرد اور ایک عورت پیدا ہوئی۔ مرد و راج تھا اور عورت شت روپا۔ پھر ان دونوں سے سوایم بھو پیدا ہوا۔ (دیکھو لفظ برہما) اسی منو کی طرف منوسمترتی منسوب ہے۔ زمانہ حال کی نسل ساتویں منو سے چلی ہے۔ اس منو کا نام دئی دسوت ہے۔ متیسہ دیوتا نے اسی کو ملوفان کی خبر دی تھی۔ (دیکھو لفظ متیسہ) چھ منو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ہر منو کی عمر (۴۳) لاکھ (۲۰) ہزار سال کی ہوتی ہے۔

شوی، ایک زاہد اور سخی راجہ تھا۔ ایک دفعہ اگنی دیوتا نے کبوتر کی صورت اختیار کی۔ اندر دیوتا نے بازن کر اس کا تعاقب کیا۔ کبوتر نے اس اجہ کی گود میں پناہ لی۔ باز نے راجہ سے کبوتر کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنے جسم سے گوشت کاٹ کر چاہا کہ اس کبوتر کے برابر تول کر دے؛ مگر کبوتر کا وزن زیادہ تھا، اس نے پھر گوشت کاٹا؛ مگر وہ بھی وزن میں پرانہ اترتا۔ مجبوراً اپنا سارا جسم کبوتر کے مقابل ترانہ دیا۔ اس کا

پتے برابر ہو گئے اور باز آ کر گیا۔

۱۰

و ر آدھ یہ ایک نمب آدم خور راجہ تھا۔ ونگ کے جنگل میں اس نے سری رام چندر جی کا مقابلہ کر لیا۔ اس کے جسم پر کوئی وارکار گرنہ ہوتا تھا۔ پہاڑ جیسا قد تھا۔ آنکھیں کھوکھلی تھیں۔ مونہ حد سے زیادہ چوڑا تھا۔ پٹا بھہڑا ہوا تھا۔ جسم لمبا اور شکل ہیبت ناک تھی۔ شیر کی خون آلودہ کھال اس کی پوشاک تھی۔ آداز میں گج تھی۔ نیزہ ہاتھ میں تھا۔ شیر پھیتے، بھیڑیے اور ہاتھی کے سر لٹکائے ہوئے تھا۔ سری رام چندر جی نے تیر مارا، تو کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے سری رام چندر جی اور بچھن جی کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ انھوں نے اس کے بازو توڑ ڈالے۔ گھونسوں سے خبر لیا، ڈر کر اسے قتل نہ کر سکے۔ مجبوراً ایک گزھا کھود کر اسے زندہ در گور کر لیا۔

لوپامدرا رشی اگست کی نہایت حسین بیوی تھی۔ جب شی مذکور نے چاہا کہ اپنی مرضی کے مطابق کسی عورت سے شادی کرے، تو اس نے مختلف حیوانات کے خوب صورت اعضا کو ترکیب دے کر ایک نہایت حسین لڑکی بنائی اور پوشیدہ طور پر ایک راجہ کے محل میں لوادی دہاں راجہ کی لڑکی سمجھی گئی اور شہزادیوں کی طرح اس کی پرورش کی گئی۔ جب جوان ہوئی، تو رشی اگست نے راجہ سے شادی کی درخواست کی۔ راجہ کا دل نہیں چاہتا تھا، مگر رشی کا سوال رد کرنا گناہ تھا۔ چنانچہ اس نے رشی سے لوپامدرا کی شادی کر دی۔

نل دمن۔ نل عاشق اور دمن اس کی مشوقہ تھی۔ دونوں کا قصہ مشہور ہے۔ فیضی نے فارسی میں اس قصہ کو ایک مثنوی میں نہایت فصاحت سے بیان کیا ہے۔ دمن راجہ جیم دالی برار کی لڑکی تھی۔ نل دوسری ریاست کا راجہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ذکر سن کر باہم عشق کرنے لگے۔ دمن نہایت حسین تھی۔ نل بہادر حسین، نیک مزاج، شہ سوار اور سپہ گری کا ماہر تھا، ساتھ ہی قمار بازی کی لت بھی تھی۔ راجہ جیم نے دمن کی شادی کے لیے میسرے کی تیاری کی۔ امیدواروں میں نل بھی تھا۔ نل کے علاوہ چار دیوتا یعنی اگنی، اندر، ورن اور یم بھی امیدوار تھے۔ اگرچہ دیوتاؤں نے نل ہی جیسی شکل بنالی تھی، مگر دمن نے اپنے مطلوب کو پہچان لیا اور اسی کا انتخاب کیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ راجہ نل کا ایک بھائی لشکر تھا، جو اس سے دل میں حسد رکھتا تھا۔ اس نے نل کے ساتھ جو کھیلنے کی طرح ڈالی۔ لشکر کھیل میں فریب کر کے اس پر غالب آ گیا۔ نل کو اس نازی میں سب کچھ ہار دینا پڑا۔ اب تمام ملک لشکر کے ہاتھ میں آیا۔ اس نے تخت پر بیٹھے ہی اعلان کر دیا کہ میری رعایا میں سے کوئی نل اور دمن کو کسی قسم کی مدد نہ دے۔

ایک عرصے تک دونوں مصیبت زدہ جنگلوں میں پھرتے رہے۔ آخر کار نل نے اس خیال سے کہ دامن تکلیف نہ اٹھائے اور اپنے گھر چلی جائے، ایک دن سونے کی حالت میں اُسے چھوڑ کر آگے کی طرف کوچ کر دیا۔ دامن اپنے گھر پر نہیں گئی، ملک چیدی کے شہزادے کے ہاں پناہ گزیں ہوئی، مگر اُس کو دامن کا حال معلوم ہو گیا۔ اُس نے اُس کے باپ کے گھر مجھو ا دیا۔ نل کو ایک سانپ نے کاٹا۔ موت تو نہیں آئی، مگر نخل بالکل مفلک گئی۔ وہ بہت بد صورت اور کوتاہ قد ہو گیا۔ شدہ شدہ وہ راجہ رتو پرن الی ابودھیہا کے ہاں ملازم ہو گیا۔ دامن کے باپ نے ہر چند نل کی جستجو کرائی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک برہمن نے خبر دی کہ نل زندہ ہے اور کسی جگہ موجود ہے۔ اُس نے برہمن کا جھوٹا بیج معلوم کرنے کے لئے دوسری دفعہ سویمبر کی تیاری کی۔ راجہ رتو پرن سویمبر میں شریک ہوا۔ نل اُس کا رہتا تھا۔ دامن نے اُسے کچھ کچھ پہچانا، مگر یقین نہیں ہوا۔ جب اُس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دامن نے کھایا، تو فوراً اپنے شوہر کو پہچان لیا۔ دونوں باہم ملے، یوتاؤں کی مدد سے نل اپنی اصلی صورت پر آیا۔ پھر اُس نے اپنے بھائی شکر سے چور کھیلنے کی تیاری کی۔ اِس دفعہ وہ بازی جیت گیا۔ اپنی سلطنت واپس حاصل کی، بلکہ شکر کی بیوی بھی جیت لی، مگر نل نے اُس کو معاف کر دیا اور کوئی ایذا نہیں پہنچائی۔

ہندو ادبیات سے بطور مثال کے جو تعلیمات ہم نے اخذ کی ہیں اُن کا اس قدر بیان غالباً خاتمہ مضمون | کافی ہوگا، مگر جس ہندو ذخیرہ کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں، اگر اُس کو ہمارے شاعر اور ہمارے انشا پرداز غور کی نظر سے مطالعہ کریں گے، تو اُن کو اس ذخیرہ سے بہت سی دلچسپ تعلیمات مل سکیں گی۔ اسی طرح جس اسلامی اور غیر اسلامی ذخیرہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اگر اُن سے بھی کام لیا گیا، تو اداسے خیالات کے بہت سے نئے سانچے ہاتھ آئیں گے۔ آخر میں ہم دو باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ کو خصوصیت کے ساتھ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

(پہلی بات) تو وہی ہے، جس کو ہم شروع مضمون میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی "انسانی زندگی، انسانی ترقی اور انسانی معاشرت کے اس قدر پہلو ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر پہلو کے لئے ایک نمونہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلاں انسان اس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ فلاں آدمی میں اس قسم کے اخلاق موجود ہیں، مگر یہ ضرور نہیں کہ ہماری گزشتہ تاریخ میں بھی کوئی ایسا نمونہ موجود ہو؟" اِس لئے ضروری ہے کہ یا تو

۱۱۔ ہم ایک خاص نمونے کے انسان کی صحیح تصویر تھے کے پیرایہ میں کھینچیں۔ پھر دیگر مصنفین جب اس نمونے کے شخص کا ذکر کریں، تو اس قصے کے نمونے کو تسلیم بنا کر اُس سے کام لیں۔ یا (۲) اگر ہماری زبان کے مشہور قصوں میں کسی خاص نمونے کے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس نمونے کو تسلیم کا لباس پہنادیں۔ یا (۳) اگر اُن قوموں کی تاریخ دیو بالا اور ادبیات میں (جو ہم سے گرد و پیش آباد ہیں اور جن سے ات دن ہمارا سابقہ ہے مثلاً ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی وغیرہ) خاص خاص نمونوں کے اشخاص کی تصویریں دیکھنے میں آئیں، تو ان نمونوں کو بے تکلف تسلیم بن لیں۔

(دوسری بات) یہ ہے کہ تسلیم کی بنیاد اکثر مشہورات پر ہوتی ہے، نہ کہ حقائق پر۔ اس لیے جن باتوں سے تسلیم اخذ کی جاتی ہے، اُن پر یہ اعتراض کرنا سراسر حماقت ہے کہ ان باتوں کا ثبوت عقل یا نقلاً نہیں ہوتا۔ جب ہر تسلیم کسی خیال کے ادا کرنے کا ایک سانچہ ہے اور یہ سانچہ اس لیے کام میں لایا جاتا ہے کہ اس خیال کی تصویریں سننے والوں کی نظر کے سامنے آجائے، تو ضروری ہے کہ تسلیم کی بنیاد جس بات پر رکھی جائے وہ لوگوں میں مشہور ہو۔ اس بات کی ہم کو مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ اصلی اور واقعی بات کیا ہے۔ کیوں کہ جو بات اصلی اور واقعی ہے اور جو عام لوگوں میں مشہور نہیں ہے اور جو صرف محققین کے دماغ میں ہے، اگر ہم اپنے خیال کے چہرے پر اُس کا نقاب ڈالیں گے، تو اس نقاب سے اُس کا حسن و بالا نہیں ہوگا؛ بلکہ نامد پر جائیگا اور جو غرض تسلیم سے ہے، وہ بالکل فوت جائیگی۔ مثلاً سور یہ یعنی سو بچ کہ عام ہندو ایک دیوتا مانتے ہیں۔ اُن کے ادبیات میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ اس دیوتا کے رتھ کے آگے سات گھوڑے چمٹے جاتے ہیں۔ بس اسی خیال پر تسلیم کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ ایک زیرک طبع تعلیم یافتہ ہندو کہہ سکتا ہے کہ سو بچ کے رتھ میں سات گھوڑوں کا جوتا جانا محض ڈھکوسلا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ سو بچ کی شعاع سات رنگوں سے مرکب ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ نے سائنس کی اس قدر ترقی کے بعد جس حقیقت کا سراغ لگایا ہے، ہمارے بزرگوں کی نظر اُس پر ہزاروں سال پہلے پڑ چکی ہے۔ ممکن ہے کہ اس تعلیم یافتہ ہندو کا یہ خیال درست ہو؛ مگر جو شعاع اور انشا پر از اس تسلیم سے کام لینا چاہتا ہے، اُس کو اس موشگافی کی مطلوبہ ضرورت نہیں ہے۔ وہ اسی عام اور مشہور خیال کو تسلیم کا لباس پہنا نا پسند کرے گا۔ اُمید ہے کہ ہمارے شاگردوں اور انشا پردازوں کے لیے یہ اشارہ کافی ہوگا۔

یامیں

از

(جنابجی لوی سید ہاشمی صناعی کنڈا راجہ عثمانیہ یونیورسٹی)

پہلی نظر اور پہلا اثر سب غریزہ اور سبے بہا چیز ہی۔ اس کا قائم رکھنا اور اُسے مناسب الفاظ میں
طور سے ادا کرنا دانش پر از ہی یا شاعری کی جان ہے۔

شام کا سما ہے۔ چمن میں موتے کا پھولوں بھرا پودا اپنی بہار دکھا رہا۔
اپنی سہانی روشنی سے اس پر لطف منظر میں عجیب کیفیت پیدا کر رہا۔
اُس پونے پر پڑتی ہے۔ اُس سے جو اثر اُس پر ہوتا ہے اور وہ
ہوتے ہیں۔ انہیں وہ ذیل کے چند اشعار میں نہایت

تیرہ فامی شام کی دریاغ کا سبزہ ادا۔
چاندنی میں چاند کی خنک بھی تھی ز۔

چشمِ دلِ ظلمات میں اے پھول اک
بانٹ دے اپنا اُجالا آج

ہندی شاعری

(۱)

(از جناب پنڈت جتیشور پرشاد صاحب مائل دہلوی)

آج اڈیٹر صاحب اردو کی فرمائش سے میں اپنے دوستوں کو ہندی کے چمن طرازوں کی طرزِ چمن طرازی دکھاؤں گا۔ خدامیری کوشش میں مجھے کامیاب کرے۔

ہندی کے باغبانوں نے اپنے اپنے دُور اور اپنی اپنی روشوں میں کیسے کیسے خوش رنگ خوش وضع اور خوشبودار پھولوں کے تختے سجائے ہیں۔ واللہ یہ امر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

اگرچہ ہندی اور اردو دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ مگر دونوں کے حسن واد میں مغرب و مشرق کا بعد ہے۔ ایک بھولی بھالی۔ سیدھی سادی۔ اپنے پیارے پریتیم یا پتی کے سچے پریم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تو دوسری بلا کی شوخ و تنگ اور عیار و طرار ہونے کے علاوہ خود اپنے غرورِ جن سے مست ہرشار ہے۔ ایک عاشقِ مزاج اور دوسری معشوقِ صفت مگر ہیں دونوں چربانک اور چرب زبان۔ جب رزم اور بزم کی

لے مٹا یہی کہ ہندی شاعری کا معشوق خود عاشق بن کر اپنے عاشق کے ہجر میں چین و مضطرب نظر آتا ہے۔ سوت یا رقیب کا ردِ ناس میں نہیں ہے۔ اور جہاں سوت کا جلا پاپا جاتا ہے وہ شاعری ادنیٰ اور ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ بیان میں فصاحت۔ بلاغت۔ موزونیت اور شوکتِ لفظی کے ساتھ سادگیِ سنجیدگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے اردو شاعری کا معشوق پورا ہر جائی اور پکا حد شکن ہوتا ہے۔ عاشق کو معشوق کے ظلم و جور کی شکایت کے ساتھ قدم قدم پر رقیب کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ بیان میں اور جملہ خوبیوں کے ساتھ نہایت خوشنما شوخی طرازی اور جذبات کی گہری تاثیر پائی جاتی ہے۔ اور ایسی زبان ہمیشہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ قوموں کے میل جول سے اولتی بدلتی رہتی ہے۔ جیسے آج کل اردو اور ہندی

داتا سنس سنانی ہیں تو سننے والوں کو ہنسا کر یا رُلا کر ہی چھوڑتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی علمی مطالب کے ادا کرنے میں کم بیش دونوں قاصر ہیں۔

یہ ماننا کہ دونوں کی پیدائش کا وقت اور زمانہ بالکل ایک ہی۔ مگر تعلیم اور پرورش علیحدہ علیحدہ ہوئی ہے۔ ہندی کو اُس کی مان پرست اور خالہ سنسکرت نے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ اور اُر دو کو عربی فارسی کی دہ سے اپنی چھاتی سے لگا کر پروان چڑھایا ہے۔ اس لئے اُر دو میں شوخی۔ طر آری فصاحت۔ بلاغت۔ شجاعت اور جراری کے ساتھ اگر کافی شیرینی اور کسی قدر متانت بھی پائی جاتی ہے تو یہ اُس دایہ کے دودھ کا اثر ہے۔ اور ہندی میں اگر سید سادگی۔ سنجیدگی۔ متانت۔ شائستگی۔ اور بھولے پن کے پہلو بہ پہلو کسی قدر شجاعت۔ بہادری بناؤ سنگار۔ رسیلا اور چٹکیلا پن بھی موجود ہے۔ تو یہ اُس نے اپنی ماں اور خالہ سے جائز طور پر ورثاً حاصل کیا ہے۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہے۔

میرے دوستو! یہ ان دونوں زبانوں کی وہ دو خاص ادائیں ہیں جن سے ان کی صورت۔ سیرت اور طرز و انداز میں ایک عجیب فرق اور غیرت پیدا ہو گئی ہے۔ ورنہ دراصل ذات۔ نسل اور خون دونوں کا ایک ہی۔ کیوں کہ آخر تو ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ہاں صرف تعلیم و تربیت مختلف ہے اور اسی اختلاف نے دونوں کو دو جدا جدا سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیا ہے۔

جس گروہ نے ہندی کو اپنا بنایا اُس میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں تو میں پہلو بہ پہلو مشاطہ گری

لے یعنی وہ زبان جو ہندوستان میں فطرتاً بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جسے بچے اپنے والدین سے خود بخود دیکھ لیتے تھے مگر سنسکرت ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ساں اور اٹل رہتی ہے۔ کیوں کہ سنسکرت اُسے کہتے ہیں جسے وقت کی موجودہ پراکرت سے ہر عہد کے علما الفاظ کو صرف و نحو اور قواعد کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ڈھنگ اور مطلب کا بنالیتے ہیں۔ لہذا اُس کی صورت اور رنگ روپ میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اگرچہ الفاظ اُس میں بھی ہمیشہ نئے نئے شامل ہوتے رہتے ہیں اور زبان کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ مگر بیا کر ڈال یعنی صرف و نحو چوں کہ وہی قدیم اور مقصد رہا ہے اس لئے اُن کے اثر سے اُس میں جو لفظ نیا شامل ہوتا ہے وہ کچھ ایسا اپنا رنگ اور دُور بدل کر لیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو بالکل ایسی نسل کا بچہ معلوم ہوتا ہے اور پھر کثرت استعمال سے اُسی کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص بلا سنسکرت کا بیا کر نہ پڑے سنسکرت بولنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتا تھے یعنی سکون اور اطمینان۔

کرتی رہیں۔ اور جو گروہ اُردو کا دعویٰ دار بنا اُس میں بھی جیسا کہ دونوں زبانوں کی تاریخ اور تذکروں سے ثابت ہے۔ بلکہ آج بھی خدا کے فضل سے دونوں جانب جیتے جاگتے بہتے کھیلنے نمونے اور ثبوت موجود ہیں ہاں کثرت اور قلت کی بات دوسری ہے۔

میں جب مادرِ ہند کے دو فرزندوں کو آپس میں فقط اس امر پر لڑتے جھگڑتے اور بحث کرتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ ایک کتاب ہے ”میری ہندی“ اور دوسرا کتاب ہے ”میری اُردو“ تو مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔ واللہ میں دونوں کو جھوٹا اور کاذب جانتا ہوں۔ بلکہ معاف کیجئے گا غاصب بھی کیوں کہ میں دیکھتا ہوں سرِ تح ایک دوسرے کا ورثہ اور حصہ بالکل زبردستی ناجائز طور سے تلف اور غصب کر رہا ہے۔ مگر نہ دل شرماتا ہے نہ آنکھ جھپتی ہے۔ مجھے شرمناک حرکت پر اکثر غصہ آتا ہے۔ مگر دل ہی دل میں جلتا ہوں اور مارِ دم بُریدہ کی طرح پیچ و تاب کھا کر میٹھ رہتا ہوں بقول شخصے ع قمر درویش بجان درویش۔

تاہم میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ حماقت آمیز ظلم دونوں زبانوں کو یکساں نقصان پہنچا رہا ہے۔

میرے دوستو! میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی۔ کیوں کہ ہندو ہندی کے مالک بنتے ہیں اور مسلمان اُردو کے۔ اس پر ایک کو دوسرے کی رائے اور پسند سے گریز اور نفرت بھی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے دونوں زبانوں سے برابر کی محبت ہے۔ میری نظر دونوں کے حُسن و قبح پر یکساں جمی ہوئی ہے۔ میں دونوں میں ایک ایسی دلچسپی اور دل بُھانے والی آواز دیکھتا ہوں کہ مجھے یہ بھی محبوب و مطلوب نظر آتی ہے اور دلچسپی میں کسی سے بھی اپنی محبت کم نہیں کر سکتا۔ مجھے آدھا ہندو اور آدھا مسلمان یا مرد و فریقین بننا منظور مگر میں اُردو کو نظر انداز کر دوں، یا ہندی سے ترکِ محبت کر لوں یہ قطعی نامنظور ہے۔

کسی کے نزدیک ہندوستان کی ملکی زبان اُردو ہو یا ہندی مگر میرے نزدیک یہ دونوں خالص میری اور اسی ملک کی زبانیں ہیں۔ قدرت نے جہاں مجھے پیدا کیا ہے وہیں ان دونوں زبانوں کو جنم دیا ہے۔ اور چونکہ مجھے بہت پہلے پیدا ہوئیں ہیں اس لئے ”نچھران کا بزرگانہ حق“ بھی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ میں کس کا حق فراہم بن جاؤں کس کو یا درکھوں اور کسے بھلاؤ۔

دونوں میں بڑھی چڑھی ہیں۔ تہِ تربیت پائی۔ اقبالِ ہندو اور مسلمان دونوں رہے۔ آج ان دونوں

زبانوں کے طرز و انداز میں جو دلکشی اور دلربائی نظر آتی ہے۔ دونوں قوموں کی مشترکہ محنت عرق ریز کا نتیجہ ہے جس سے کوئی عقل سلیم رکھنے والا ہندو یا مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ لہذا کوئی لڑے یا جھگڑے۔ مگر جس کی مٹی جہاں کی بڑی رہے گی اور وہیں کی سمجھی جائے گی بدل نہیں سکتی۔

اور مرزا یہ ہے کہ دلی۔ لکھنؤ اور پنجاب کو چھوڑ کر تمام ہندوستان میں دونوں زبانیں آج بھی بلا تکلف بولی جاتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں بولتے سمجھتے ہیں۔ البتہ مسلمان ہندی میں اور ہندو اردو میں خصوصیت کے ساتھ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے نزدیک یہ دونوں قوموں کی سخت غلطی ہے اور یہ غلطی نہ صرف ان دونوں زبانوں کے لئے بلکہ اس ملک کی علمی۔ اخلاقی۔ تمدنی اور حقیقی زندگی کے لئے بھی ایک ملک اور دو بانی مرض سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندوؤں کا لٹریچر ہندی میں زیادہ ہے اور مسلمانوں کا اردو میں۔ لہذا جب تک دونوں زبانوں میں یکساں اور کافی مہارت نہ پیدا کی جائے گی ایک کا دوسرے کو صحیح طور سے سمجھ لینا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ آزاد اور قومی درگاہوں میں خواہ وہ ہندوؤں کی ہوں یا مسلمانوں کی ہندی اور اردو کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جائے۔ اور دونوں کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ ہندو اور دو کے ناز اٹھائیں اور مسلمان ہندی کے چاؤ چو پنچلوں سے اپنا جی بہلائیں دونوں بلا تکلف آپس میں تبادلہ خیالات کر سکیں۔ ایک دوسرے کو سمجھے، جانے پہچانے تاکہ آپس کی مناسرت لگھے اور محبت سوا ہو۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا ایک کی نظر میں دوسرے کی حقیقی اور درجہ عزت پیدا نہیں ہوگی۔

یہ امر مسئلہ ہے کہ جس دل میں اپنے رفیق یا ہمساہ کی عزت نہیں ہے۔ اُس کی محبت اور الفت بھی نہیں ہے اور بلا محبت کے ایک گھر میں دو بھائیوں کا یا ایک ملک میں دو قوموں کا آپس میں مل جل کر رہنا یا امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنا بالکل ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ نوز و ظلمت اور آب و آتش کا ایک وقت اور ایک ہی جگہ جمع ہو جانا۔

”اردو کے ناظرین حسن اردو کا جلوہ تو ہمیشہ بے محابا اودوں کے کتب دیکھتے ہیں اس لئے اُس کی تعریف ہے۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ آج تو وصف میں کاغذ سیاہ کرنا بے سود ہے۔ البتہ ہندی اور اردو کا تعلیم دینا

میں اس مختصر تحریر میں صرف چھ شاعروں کا تذکرہ پیش کروں گا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بالکمال سخنور کندھ سے کندھا ملائے ہندی کی خدمت کرتے ہوئے نظر آئیں گے جو اپنے نمونہ سے ہمیں اخلاق اور بے تعصبی کا سبق دے کر آئندہ کے لئے ہماری زندگی کا دستور العمل یا طرز معاشرت سمجھائیں گے۔ جن شعراء کو اپنے نزدیک قابل ذکر سمجھا ہے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

پورا نام اور تخلص

- ۱۔ ملک الشعراء یا مہاکوئی پنڈت بہاری لال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہاری
۲۔ ہما تماشری سُر داس جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُوریا سُور داس
۳۔ خان خاناں عبدالرحیم خاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رحیم یار حُمن
۴۔ سید مبارک علی بگلر می ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مبارک
۵۔ ہما تپنڈت بنارسى داس جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بنارسى
۶۔ پنڈت دولت رام جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دُول یا دولت

پنڈت بہاری لال بہاری

یہ ہندی شاعری کا سرتاج کلور خاندان میں ایک ”ماتھر“ برہمن کے گھربو اگو بند پور ضلع گوالیار میں پیدا ہوا تھا۔ سن تولد ۱۶۶۰ و کرمی یا ۱۶۰۳ عیسوی کہا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں اس کا بچپن بُندیل کھنڈ میں اور جوانی تمام کمال متھر بند رابن میں گزری ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جنہیں ہندی یا برج بھاشا کی کمال کنا چاہیے۔ لہذا اس باکمال شاعر کو ہندی کے اہل زبان ہونے کا یوراپور انحر حاصل ہی۔

یہ زمانہ اُورنگ زیب کا زمانہ تھا اور بھاری لال میسرز ہمارا جہ جے سنگھ سوانی والی ہے پور کے مداح تھے۔ اس لئے ان کی باقی تمام عمر اسی دربار میں بسر ہوئی۔ دربار کی قدر دانیوں نے ان کی خوب

خوب حوصلہ افزائی کی۔ علاوہ پیٹے اور تنخواہ کے فی دوہا ایک اشرفی کا انعام مقرر تھا۔ لہذا میرزا مہاراج کے سایہ میں رہبران کی شاعری کا گلدستہ کچھ ایسا سجا اور ایسا مہکا کہ اُس وقت سے لے کر آج تک ہندوؤں میں صد ہا سخن سنج ہوئے اُسی کی خوشبو کے متوالے رہے اور آج تک ہیں۔

شاید مہاراج سوائی جے سنگھ دوہوں کے بڑے قدردان تھے۔ اس لئے اس کی شاعری میں صرف دوہے ہی دوہے ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اور بحروں میں بھی بہت کچھ لکھا ہو۔ مگر افسوس ان کا باقی کلام آج کل دستیاب نہیں ہے۔ اور وہ دوہے بھی بہت تھوڑے کل ۱۹ء میں جو ایک کتاب کی صورت میں چھپے ہوئے ہیں اور بہاری "ست سہی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اتنے بڑے شاعر کا اتنا مختصر اکلام ہونیس سکتا۔ مگر خدا جانے اُس کے دوسرے بے بالالوں کو زمانے کی دست بُرد نے قدر دانوں کی نگاہ سے چھپا کر کہاں کا کہاں پہنچا دیا۔

شکر ہے کہ وہ ۱۹ء دوہے بھی ۱۹ء گوہر نایاب ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جوہریاں سخن کی دوکانوں کے جواہرات بائیں مدغم اور بے آب نظر آتے ہیں۔ ان دوہوں پر تقریباً ۳۰ ہندی شعرا نے بڑی بڑی ضخیم ٹیکائیں لکھی ہیں اور اکثر نے ان کے مضامین چرا کر اپنی جدا جدا شاعری کی ہی جگہ ع حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک دفعہ میرزا مہاراج جو سنگھ ایک کم سن رانی یا گل ناریدہ کے پریم میں لیے پھنسنے کے محل سے برآمد ہونا اور دربار میں آنا بالکل ترک کر دیا۔ مصاحبوں اور مالکداروں میں اس کا چرچا ہونے کا تب بہاری نے ایک دوہا لکھ کر کسی حکمت علی سے مہاراج کے پاس پہنچایا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسی روز مہاراج محل سے برآمد ہوئے۔ دربار کیا۔ اور بہاری لال کو خلعت فاخرہ کے علاوہ عمدہ اور منصب بھی عطا فرمایا۔ وہ دوہا یہ ہے۔

دوہا

نہیں پام نہیں مधुर मधु. नहि विकास इह काल

अली कली ही सैं बंधो, आगे कौन हवाल ॥

لے ٹیکہ اشرفی کو کہتے ہیں

نہیں پرگ۔ نہیں مدھر مدھو۔ نہیں بکاس انھیں کال
الی مگلی ہی تیں بندھیو آگے کون حوال

دوہا

شاعر کہتا ہے: ”ابھی اُس میں نہ تو زبرِ گل یعنی وہ ذرے ہیں جو پھول میں سے نکل نکل کر دُور تک
لوگوں کے دماغوں کو معطر کیا کرتے ہیں۔ نہ میٹھا شہد ہی اور نہ ابھی شگفتگی ہے۔ بھونرا صرف کلی یا غنچہ نا
ہی میں الجھ کر رہ گیا ہی نہ جانے آگے چل کر اس کا کیا حال ہو گا۔“

ابا ہا باری نے اپنے بھونرے کی خیر خواہی کا کتنے اچھے لفظوں میں ثبوت دیا ہے۔ کیسی گہری
دُور اندیشی ہے۔ کتنے میٹھے اور خوشگوار الفاظ میں نصیحت کا امرت پلا یا ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی ایک
ذی مرتبہ شخص اپنی حیات کی لذت میں اندھا ہو کر محو ہو گیا ہے اور اُس محویت سے آئندہ یقینی طور پر جو ناگوار
نتیجہ پیدا ہونے والا ہے اُس سے مخالف ہو کر ایک خیر خواہ دوست اُسے نصیحت کرنا چاہتا ہے مگر ساتھ ہی
ڈرتا بھی ہے کہ کہیں میرے الفاظ سے میرے دوست کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اُس کے لئے اس سے
اچھا اسلوب پیدا نہیں ہو سکتا۔ باری کہتا ہے۔

دوہا

वाम बाँह फरकत मिले, जो हीर जावन मूरि।
तौ तोही साँ भेटिहो, राखि दाहिनी दूरि॥

بام بائٹھ پھرکت ملیں جوہر جیون موری

تو تو ہی سون بھیٹ ہوں راکھ داہنی دُور

دوہا

واضح ہو شگن شاستر ”یا علم شگون کی رُوسے مر دُکے داییں اور عورت کے بائیں بازو کا پھرنے کا کسی بڑی
خوشی یا مسرت کا مر دُہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک عاشق کے لئے اپنے معشوق سے بغلیں دہم آغوش
ہونے کے سوا اور کوئی مسرت نہیں ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا دوہے کی موضوعہ یا ہیروائن کہتی ہے کہ

لے ”ہیر دُ اور ہیروائن“ یہ دونوں انگریزی لفظ ہیں۔ ہندی میں ان کی جگہ ”ناک“ اور ”ناکھ“ بولا جاتا ہے۔ میں بھی انہی لفظوں سے
کام لیتا مگر اردو میں چون کہ ان الفاظ کا استعمال نہایت رکیک معانی میں کیا جاتا ہے۔ لہذا میں نے ان سے پرہیز کیا اور اُس کی جگہ ہنس
اور موضوعہ استعمال کیا ہے۔ آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا تا وقتیکہ کوئی اُن سے بہتر لفظ نہ ملے

اے بایں بھیا اگر آج تیرے پھر کئے سے میری زندگی کے سبب اعلیٰ تر بھگوان یعنی کرشن چندر مجھے آکر ملیں تو میں
 بنگلیہ ہوتے وقت اپنی داہنی بھیا کو دُور رکھ کر تجھ ہی کو آگے بڑھا دوں گی اور پہلے تجھ ہی سے بنگلیہ ہوں گی۔
 بُحان اللہ کتنا پاک اور اچھوتا مضمون ہے شاعر نے شوق وصل کی کتنی بے لوث تصویر کھینچی ہے کہ
 تعریف نہیں ہو سکتی۔ چوں کہ عاشق عورت ذات ہی۔ لہذا اُس کی کمزور فطرت۔ اوہام پرستی۔ احسانمندی بھولا پن
 اور حق خدمت کے اظہار کا خیال کتنے اچھے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اُس پر طرہ یہ کہ جیسی خدمت دیا انعام۔
 چوں کہ بایں بازو نے پھڑک کر وصل مثنوی کی خوشخبری سنائی ہی اس لئے اُس خوشی کا سبب بڑا حصہ پہلے اُنکی
 انعام میں دینے کا وعدہ کیا جاتا ہی۔ ع

تو تو ہی سون بھٹ ہوں راکھ داہنی دُور

ان الفاظ میں کتنا اثر ہے اور کیسا دلکش جادو بھرا ہوا ہی۔ اسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ پھر کتنا ہے۔

دوہا

मृदु नैनी दृग की फरक, उर उठाहत न हूल ।

विन ही पिय आगम उमंग, पलट न लगी दुकूल ॥

مرگِ نینی درگ کی پھرک۔ اُڑ اُچھاہ تن پھول

بن ہی سپہ آگم اُننگ پلٹن لگی دُو کُول

دوہا

اس دوہی میں بہاری نے اور بھی غضب کر دیا ہی۔ یاں بھی وہی شگون کا مضمون ہی ظالم کتا ہی۔ ہرن
 کی سی آنکھ رکھنے والی موضوعہ جو اپنے پیارے پتی کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اک ذرا کی ذرا بایں آنکھ پھڑکنے سے دل میں
 اتنی خوش ہوتی ہی کہ پھولی نہیں سجاتی اور اس شگون سے اُسے اپنے پریم کی آمد کا اتنا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ
 جلدی اور گھبراہٹ میں آنکھ کو انعام دینے کا خیال بھی نہیں آتا۔ بلکہ خود ساڑھی بدلنے اور سنگار کرنے لگتی ہی۔

اس سے پہلے دوہی میں موضوعہ کو یقین نہیں ہوتا بلکہ شک رہتا ہی۔ اس لئے وہ کہتی ہی کہ اے بایں بھیا اگر
 ایسا ہوا تو میں تجھے یہ انعام دوں گی۔ مگر یاں وہ بات نہیں ہی۔ یاں اتنا زبردست یقین ہی کہ خود محو تزیین و

لے بھیا سنکرت میں بازو کو کتے ہیں چوں کہ بازو تذکیر ہے اور بھیا تائیت مجھے یاں تائیت ہی کی ضرورت تھی لہذا مجبور بھیا ہی لکھنا پڑا

آرائش ہو جاتی ہے۔ اور گویا سمجھتی ہے کہ وہ آہی گئے۔

خاقانی ہند حضرت ذوق علیہ الرحمۃ نے اسی مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے ادا کیا ہے وہ فرماتے ہیں
 سُن کے آمد ان کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے یکھ جائے
 اس شعر میں معشوق کی آمد کی خبر سُن کر پیشوائی کو جانا اور دوسے میں محض اپنی ہی بائیں آنکھ کے پھرٹکنے سے
 معشوق کی آمد کا یقین کا بل ہو جانا۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شعر کے خیال سے دو ہی
 کا خیال نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ مگر دوسے کا یہ خیال کہ معشوق کی آمد کے یقین سے فقط محو آرائش و زیبائش
 ہو جانا ایک معمولی بات ہے۔ تاہم موضوع کلام چوں کہ خود معشوق بمنزلہ عاشق ہے لہذا اُس کے لئے
 نہایت موزوں ہے اور شعر کے مشکل کا فقط لفظ از خود رفتہ سے پیشوائی کو جانے کے معنی پیدا کرنا گویا شاعری
 کا کمال ہے۔ اور معشوق کی آمد پر جو عاشق کے دل میں فطرتاً ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے اُس کا نہایت مؤثر
 اور بین ثبوت ہے۔

ہندی کا ایک اور شاعر ”توش ندھی“ اسی مضمون پر ایک کبت لکھا ہے۔ اُس میں گویا یقین کے بجائے
 وہی انعام کا قصہ ہے۔ مگر کبت چوں کہ دوسے کی نسبت سے ایک بہت بڑی بھرکا نام ہے۔ لہذا اُس میں
 مضمون اور الفاظ کے لئے کافی گنجائش ہے۔ اس لئے شاعر مذکور کو اپنے مضمون کے ادا کرنے کا بہت
 اچھا موقع ملا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

کبیت

پہنچنی گھڑا چو پُنج سونے سے منڈائی دیوں۔ کر پر لائی پر پُنج سونے سے دھیر ہوں
 کھائی کھیتو پھلین اٹکھن لئے ہو ، کبوائی کچن کٹوے آٹا کھانے پر پُنج سونے سے دھیر ہوں
 رے کرے کھانے تیرے شکون سَنوگ ، آنا میرے پتی آوے تو بچن تیرے پیر ہو ،
 کرتی کرار تون پہلے کھو گئی رہ ، اپنے پییا کو فیر پیہ اُگ بھار ہو

کبیت

پہنچنی گھڑا چو پُنج سونے سے منڈائی دیوں۔ کر پر لائی پر پُنج سونے سے دھیر ہوں
 کھائی کھیتو پھلین اٹکھن لئے ہو ، کبوائی کچن کٹوے آٹا کھانے پر پُنج سونے سے دھیر ہوں

اے رے کارے کاگ تیرے شکن سبک۔ آج میرے پتی آویں تو بچن تے نہ ٹھہروں
 کرتی کراتوں پہلے کروں گی سب۔ اپنے پایا کو پھر پیچھے انگ بھسروں
 چوں کہ علم شکنوں میں کوتے کا کسی خاص سمت میں بولنا بھی اپنے پیارے کی آمد کا مبارک شگون
 سمجھا جاتا ہی۔ لہذا کبت کی موضوعہ کہتی ہے کہ میں تیرے لئے پیچنی گھڑوا دوں گی۔ تری چونچ کو سونے
 سے منڈھوا دوں گی۔ ہاتھ پر بٹھا کر نہایت پیار سے تیرے پروں کو سنواروں گی۔ تجھے کبھی ایک لمحہ
 کے لئے بھی نہیں بھولوں گی۔ سونے کے کٹورے میں دودھ بھر کر تیرے لئے اٹاری پر رکھ دوں گی۔
 اے کالے کوتے آج تیرے شگون کے مطابق اگر میرے پیارے پر تیم آجائیں گے تو میں اقرار کرتی ہوں
 کہ اپنے قول سے کبھی نہیں پھروں گی اور جب تک یہ تمام شرطیں پوری نہ کر لوں گی اپنے پتی سے بنگلیگر
 نہیں ہونے کی۔

اندر سے بے قراری اور شوق ملاقات۔ ایک مہجور عاشق جو عورت ذات ہی۔ اپنے پر تیم یا معشوق کی
 فرقت میں کتنی بیچین ہے۔ ایک انتہا کے ذلیل اور حقیر جانور سے کیسے کیسے اقرار کر رہی ہے۔ اور پھر اُس
 اقرار نامے کی آخری شرط کتنی کڑی اور کیسی مشکل ہے کہ میں اپنے معشوق سے ہم آغوش ہونے سے
 پہلے تیری یہ تمام شرطیں پوری کر دوں گی؟ واہ واہ واہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اُس پر طرہ
 یہ کہ خیالات جو ایک عورت کی زبان سے ادا ہو رہی ہیں وہ اُس کے لئے نہایت موزوں اور فطری واقع
 ہوئے ہیں لہذا جس قدر داد دیجائے کم ہی۔ مگر باری نے اپنے دوسے کی بحر خفیف میں جو کچھ کم دیا ہے
 وہ کمال کیا ہی۔ اور سنئے :-

دوہا

فیر فیر چیت اُتہی رھت، دھٹی لاج کی لاج ۔

اُنگ اُنگ دھاک ہائر مے ، مہو ہائر کی لاج ॥

پھر پھر چیت اُت ہی رہت۔ ٹوٹی لاج کی لاؤ

اُنگ اُنگ چھبی جھور میں بیو ہونر کی ناؤ

لے جیسے شوقین لوگ اپنے پالو کو تروں کو پہناتے ہیں۔

کتاہی۔ دل ہر پھر کراؤ دھر ہی جاتا ہی۔ وہیں رہتا ہے۔ شرم کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ معشوق کی ہر حصہ جسم کی صفائی اور لطافت اُسے رہ رہ کر اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کھینچا تانی سے دل بھنور پھنسی ہوئی کشتی کی مثال بنا ہوا ہی۔

ا ہا ہا اُنک اُنک چھپی جھوڑ کا بھنور کتنا موزوں اور خوبصورت بھنور ہے کاش میں آپ کو الفاظ کی لذت سے محفوظ کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجے ۵
زفر قریب دم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشہ کہ جا اینجاست

دوہا

सखी सिरखाव मान विधि, सैनन वरजति वात्स।

हरु ये कहि मो हिय बसत, सदाँ विहारि लाल॥

سکھی سکھاوت مان بدھ سینن برجت بال
ہر وہ کہ موہیے بست سداں بہاری لال

دوہا

میری دوستو! اس دوہی کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اس کا مضمون بھی جہاں تک میرا خیال ہی بالکل نیا ہی۔ ایک بھولے بھلے کم سن معشوق کو اُس کی سکھی یا سہیلی اپنے عاشق سے ناز کرنا سکھا رہی ہی۔ عاشق کون؟ دوہی کا مصنف بہاری لال سکھی کیا سکھا رہی ہے؟ ”مان بدھ“ یعنی انداز ناز اور غرور کرنے کا طریقہ جس پر بگڑنا۔ روٹھنا۔ ضد کرنا۔ نچلنا اور جلانا۔ ترسانا وغیرہ وغیرہ سب شامل ہی اور یہ اتنا لمبا چوڑا مطلب صرف ”سکھی سکھاوت مان بدھ“ کے جملے میں بھرا ہوا ہی۔

چوں کہ سہیلی کی یہ تعلیم اپنے پیارے پر تیم سے ایک قسم کی بغاوت کرنا سکھانا ہی اور بغاوت کی تعلیم میں اُستاد شاگرد دونوں کو یہ خوف رہتا ہی کہ ایسا نہ کوئی دیکھ لے سُن لے لہذا ”سینن برجت بال“ کا یہ مطلب ہی کہ وہ بھولی بھالی کم سن نازنین اُسے آنکھوں کے اشارے سے روکتی ہی۔ منع کرتی ہے اور کہتی ہے اری تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔ خبردار وہ سُن لیں گے میرے دل میں ہمیشہ بہاری لال رہتی ہیں۔ واہ دادا۔
ع خاموشی از شنائے توحہ شنائے نصبت

اور مزہ یہ ہے کہ اس دوسرے کا آخری جملہ ”موت ہے بست سداں بباری لال“ اس غضب کا جملہ ہے کہ جس کی تعریف کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی جس پہلو سے دیکھئے اس کے ایک نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ”بباری لال“ خود شاعر کا نام ہی اور معرفت کا اس میں چوچلا یہ ہے کہ ”بباری لال“ بھگوان کرشن چندر کا بھی نام ہے۔ اور بباری اُسے بھی کہتے ہیں جو ہر جگہ پھرنے والا پورا ہر جانی ہو۔ اب غور کیجئے کہ یہ تینوں معانی اپنی اپنی جگہ اس دوسرے میں کیا لطف دے رہی ہیں۔

”معتوق چوں کہ ہم طالب وہم مطلوب ہی اُردو کے شاعروں کا سابیوفا۔ ظالم اور قاتل معشوق نہیں ہے لہذا اُس کے دل میں اُس کے پیارے پر یتیم بباری لال ہمیشہ بے رہتے ہیں۔ وہ کم سنی اور بھولے بھالے پن کی وجہ سے عالم خیال کی موجودگی کو بالکل صحیح اور اصلی موجودگی سمجھتا ہے۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ اُس کا ہر فعل بباری لال ہی کا فعل سمجھنا ہوگا اور جو بات اُس سے کسی جائے گی اُسے ”بباری لال“ بھی ضرور ہی سنیں گے۔ بات چوں کہ بغاوت کی ہے۔ اس لئے وہ اتنا ڈرتا ہے۔ اپنے دوست کو اور اپنے آپ کو ماشتق کے عتاب سے بچانے کے لئے آنکھ کے اشارے سے منع کرتا ہے مُنہ سے بھی نہیں کہتا“

اگر بباری لال کے معنی بھگوان کرشن چندر مانے جائیں تو جو دل اتنا پاک اور پوتر ہے کہ اس میں ہمیشہ بھگوان بے رہتے ہیں۔ وہ اپنے پیارے پر یتیم کے خلاف بغاوت کا مشورہ سننا کیوں کر پسند کر سکتا ہے اس لئے وہ آنکھ کے اشارے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے خبردار یہ مت کہو میرے دل میں بھگوان بباری لال بے ہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا“

اور تیسرے معنی ہر جگہ پھرنے والے پورے ہر جانی کے لئے جائیں تو وہ کہتی ہے ”دیوانی! جو شخص پورا ہر جانی تھا۔ جسے ۲۴ گھنٹے پھرنے کے سوا ایک لمحے بھی قرار نہیں تھا۔ وہ جب اپنی خلقی اور جلی عادت چھوڑ کر ہمیشہ میرے دل میں رہتا ہی تو کیا ایسے شخص کے لئے مجھے یہ مناسب نہیں ہے کہ معشوق ہونے کی حیثیت سے جو غرور و ناز کرنا میری طبعی عادت ہے اُسے ترک کر دوں اور با وفا بن جاؤں؟

شاید بعض اجاب کو یہ خیال ہوگا کہ یہ معنی زبردستی پہنائے جا رہے ہیں۔ مگر جو لوگ دوسرے کے الفاظ پر غور رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ معنی زبردستی نہیں پہنائے گئے ہیں بلکہ حقیقتاً پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں کہ

رتیہ کت کینتی پڑھی۔ بن جسہ بہو نہ کمان

دوہ

چل چت بید سے چکت نہیں۔ بنک بلوکن بان

اس دوہی کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس کے دو لفظوں کی تشریح کر دینا نہایت ضروری ہے ایک ”تیہ“

(तिय) اور دوسرا ”چل چت“ (चलचित) رتیہ کے معنی میں ”ابلا“ یعنی کمزور عورت یا نازک

معشوق اور ”چل چت“ ایک مرکب جملہ ہی جو چل اور چت دو لفظوں سے بنا ہے۔ جس میں ”چل“ کے معنی ہیں ”تحرک“ بقرار۔ اور ”چت“ کے معنی ہیں ”من یا دل لہذا ”چل چت“ کے معنی ہوئے ”دل بقرار یا دل مضطر۔“

شاعر کہتا ہے اے نازک معشوق تو نے یہ فن تیرا اندازی کہاں سیکھا؟ کیوں کہ تیری ہوں جو کہاں ہے

اُس میں تو زہ نہیں ہے۔ بغیر چلنے کی ہی اور جسے تو نشانہ بنا نا چاہتا ہے۔ وہ دل بقرار ہے۔ اُسے کسی پہلو

قرار ہی نہیں ہے۔ یہاں بقراری دو معنی پر دلالت کرتی ہے۔ ایک تو عاشق کا دل ہے اس لئے بقرار ہے۔

اور ایک دل بالخاصہ بقرار ہوتا ہے۔ لہذا جو شے متحرک اور بقرار ہوتی ہے۔ اُسے نشانہ بنانا نہایت مشکل

امر ہے اور وہ تیر بھی کیسے تیر ہیں؟ کہ ”بنک بلوکن بان“ یعنی ترچھی نظر کے تیر ہیں جو ہمیشہ ٹیڑھے بانکے

ہوتے ہیں۔ بید سے ہوتے ہی نہیں۔ مگر اس پر بھی ”چکت نہیں“ وہ خطا نہیں کرتے۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔

اہا ہا ہا واہ واہ واہ دوہی کی چھوٹی سی بحر میں کتنے متضاد اسباب جمع کئے ہیں نازک معشوق بغیر

چلنے کی کمان۔ نشانہ متحرک۔ اور تیر کج مع۔ اگر اس پر بھی نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ تو پھر تیر انداز کے کمال قادر

اندازی پر جس قدر تعجب کیا جائے بجا ہے۔ ناخکھنوی جیسا مشوراً تا دکتا ہے

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلیکھ کو کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

سُجھان اللہ انداز بیان کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے مگر ان کا تیر انداز اناڑی ہے جسے چٹکی میں

تیر تھامنا بھی نہیں آتا۔ آتش فرماتے ہیں ۷

لہ زہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جسے باری نے ”جہ“ لکھا ہے۔ معنی بھی وہی ہیں صرف نہ ادرج کا فرق جس سے ہندی لب و لہجہ مجبور

ہی اور ان کے حروف تہجی میں دو حرف ہی نہیں ہیں۔ مگر اس سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ اُس وقت بھی ہندو مسلمانوں کے میل جول نے اردو توارد

ہندی پر بھی اپنا کتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا اسی طرح جہاں تک میر خیاں کی ادبی کئی جگہ ایسی الفاظ آئے ہیں مگر میں نے سو اُن پر کوئی نوٹ نہیں لکھا

ترجھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار جب تیر کج پڑے گا اڑے گا نشانہ کیا
 یہاں بھی وہی بات ہی۔ بلکہ ان کا انداز بیان بھی کچھ اچھا نہیں ہی۔ مصرعہ ثانی میں پڑے گا اڑے گا یہ
 دو روڑے ایسے ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں کہ سننے اور سنانے میں بھی لطف نہیں آتا۔ ایک اور بزرگوار فرماتے
 ہیں۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ یہ شعر حضرت میر مہدی حسین مجروح دہلوی کا معلوم ہوتا ہے۔
 خطا کرتے ہیں ٹیڑھے تیر یہ کہنے کی باتیں ہیں وہ دیکھیں ترجھی نظروں سے یہ سیدھی دل پرتے ہیں
 یہ شعر البتہ قابلِ داد ہے۔ اگر دوہے سے بڑھ نہیں گیا ہے تو دبا ہوا بھی نہیں ہے کم سے کم ہم مضمون و
 ہم معنی ضرور ہے۔ اگرچہ دوہے کی طرح بہت سے اسبابِ مخالف اس میں جمع نہیں ہوئے ہیں۔ مگر الفاظ کتنے
 موزوں اور انداز بیان کیسا سلجھا ہوا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔
 باری کا ایک اخلاقی دوہا بھی ملاحظہ ہو۔

دوہا

کنک کنک تے سौ गुनी, मादकता अधिकाय ।

अहि खाये वौराय जग, इहि पाये वौराय ॥

کنک کنک تے تنو گنی ماد کتا ادھکاے

اودھ کھائے بورائے جگ ایہہ پائے بورائے

دوہا

یہ ایک سیدھا سادہ دوہا ہے۔ جس میں بظاہر صرف ایک لفظ کی شاعری ہے۔ مگر انداز بیان کتنا دلچسپ
 اور مصرعہ ثانی کیسا برابر کے دو ٹکڑوں پر تقسیم کر کے رکھ دیا ہے کہ بغیر داد دیئے دل نہیں مانتا۔
 کنک سنکرت میں دھتورے کو بھی کہتے ہیں اور سونے کو بھی۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ کنک یعنی سونے میں
 کنک یعنی دھتورے سے تنو گنا نشہ پیدا کرنے کی طاقت ہے۔ ثبوت میں کہتا ہے دیکھو اگر دھتورے کو لوگ کھا کر
 پاگل ہوتے ہیں تو سونے کو صرف پا کر ہی پاگل ہو جاتے ہیں۔ بقول شخصے

باوہ نوشیدن و ہشیار نشستن سهل است چوں بدولت برسی مست نگر دی مردی
 یادگار غالب میں مولانا حالی مرحوم و مغفور نے میرزا غالب اور حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی شعر و کلام

ایک جگہ موازنہ کیا ہے۔ شعر مفصلہ ذیل ہیں ۷

غالب

اُن کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہی

سعدی

گفتابو دم چو بیانی غمِ دل باتو بگویم چہ بگویم کہ غم از دل برد و چوں تو بیانی
اس موازنہ کا فیصلہ مولانا نے اس طرح کر دیا ہے کہ ”مطلب تو دونوں شعروں کا تقریباً ملتا جلتا ہے مگر سعدی کے بیان میں اس قدر شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ معشوق اپنے ماضی کی ظاہری حالت سے اُس کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر سکے۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں ”معشوق کے آنے پر غم دل سے رخصت ہو جاتا ہے“ مگر یہ نہیں کہتے کہ میری ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے اور میرزا کے ہاں ظاہری حالت کا بدل جانا ہی مقصود ہے۔ غم دل بیان کرنے کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ لہذا یہاں معشوق کی غلط فہمی رفع ہونے کا امکان ہر طرح غیر ممکن ہے۔ تاہم مرزا کے شعر پر شیخ کے شعر کو ضرور ترجیح دینی چاہیے۔ کیوں کہ شیخ نے یہ شعر مرزا کے شعر سے پہلے کہا ہے۔

آبِ بہاری کا ایک دوہا ملاحظہ فرمائیے۔ اُس نے بھی مرزا سے بہت پہلے لکھا ہے اور شیخ علیہ الرحمۃ اگر پہلے نہیں تو کم از کم فارسی نہ جاننے کی وجہ سے اُس کے کان اس شعر سے نا آشنا ضرور تھے۔

دوہا

آوِ باکے تن کی دسا، دے رخیو چاہتِ آہاں

تو بلی نیکو بیلوکے، چلی آوِ چاکِ بلی

جو وا کے تن کی دسا دیکھو چاہتِ آپ

تو بلی نیک بیلوکے چل آؤ چاک چپ چپ

ایک ہمد و ہمز جو ماضی اور معشوق دونوں کا ہمد و ہمد ہے وہ معشوق سے کہہ رہا ہے ”اگر آپ اپنے ماضی کی لبت

زار دیکھنا چاہتے ہیں تو میں صدقے جا دوں ذرا اچانک اور چپ چپ چل کر دیکھئے“

مفہوم یہ ہے کہ اُسے کسی طرح یہ پتہ نہ چل جائے کہ آپ دیکھتے آ رہے ہیں ورنہ اس خوشی کی خبر سے اُس کی حالت بدل جائے گی اور آپ اُس کی حالت صحیح کا اندازہ نہ کر سکیں گے۔

اب غور فرمائیے کہ مرزا کے شعر میں معشوق کے آنے سے مُنہ پر رونق آ جاتی ہے اور سعدی کے شعر میں معشوق کے آنے سے غمِ دل کا فور ہو جاتا ہے۔ مگر بہاری کے دوہے میں محض معشوق کے آنے کی خوشخبری سے عاشق کی حالت بدل جانے کا یقین ہے۔ میرے نزدیک تو شاعر نے نازک خیالی کی حد کر دی۔ اس کے علاوہ بہاری نے جن ہندی محاورات کو نظم کیا ہے جس بندش کی صفائی اور شوکت الفاظ سے کام لیا ہے اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ اب ایک اور دوہا سنئے۔

دوہا

चिर जीवो जोरि जुरै, क्यौं न सनेह गंभीर

को घाटे ये हृषभानुजा, वेह्लखर के वीर ॥

چرخِ جو و جوری جُریے کیوں نہ سینہ لبخیر
کو گھٹ یہ پرشہا نجا وہ ہل دھر کے بیر

دوہا

ایک گوی جو برابر کی بھولی ہے وہ رادھا اور کرشن کو دیکھ کر کہتی ہے۔ ”یہ جوڑی ہمیشہ سلامت رہے۔ اگر انھوں نے آپس میں گہری محبت کا نانا جوڑا ہے تو اس میں تعجب کیا ہے۔ کیوں کہ کوئی کسی طرح کسی سے کم نہیں ہے۔ یہ پرشہا نجا ہیں تو وہ ”ہل دھر“ کے بیر ہیں۔ یعنی یہ پرشہا نکی بیٹی ہیں تو وہ ”ہل دھر“ کے بھائی ہیں۔

پرشہا ن رادھا جی کے باپ کا نام تھا۔ اور ہلدھر بلدیو جی کا۔ کیوں کہ ”ہل“ ایک خاص وضع کے ہتیار کو کہتے ہیں جو بلدیو جی کا خاص حربہ تھا۔ لہذا اُن کا نام ”ہل دھر“ یعنی صاحب ”ہل“ مشہور ہے۔

یہاں تک ایک معمولی تعریف ہے جسے شاعر نے اپنی طرف سے محبت کی وجہ قرار دیا ہے۔ مگر فی الحقیقت تعریف کے قابل وہ میٹھی چٹکی ہے جو کہنے والی سہلی برابر کی بھولی ہونے کی حیثیت سے ایک مزیدار مذاق کے طور پر لیتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

”پرشہا“ سنسکرت میں ”ہل“ کو کہتے ہیں اور ”انوجا“ بن کو لہذا رادھا کا جی تو بیل کی بن بھیا ہوئیں اور ”ہل“

زمین جوتے کا وہ اوزار ہے جسے ہندوستان میں ہمیشہ بیل ہی کھینچتا ہے۔ اس لئے ہل دھڑکے معنی ہوئے بیل اور بیل کا بھائی بھی آخر بیل ہی ہوا۔ تو مطلب یہ رہا کہ رادھا تو بیل کی بن بچھیا ہیں۔ اور کرشن چندر بیل کے بھائی بیل ہیں۔ لہذا دونوں بچھنس میں پھران میں محبت ہونی ہی چاہیے:-

واہ واواہ خدا کی قسم کی شاعری میں مذاق کی حد کر دی اور پھر کس عالمانہ پہلو سے کہ سبحان اللہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مگر اس میں شاعری کے ساتھ زبان کی وسعت بھی شامل ہے اگر زبان میں اتنی وسعت نہوتی تو پنڈت ہماری لال کو یہ مضمون میسر نہ آتا۔

اب ہماری لال کا فن تصویر کشی ملاحظہ ہو۔ ظالم نقطہ نفطوں کے ہیر پھیر سے کتنا اچھا سین کھینک دکھاتا ہے

دوہا

हेर हिंडोरे गगनते, परी परी सी दूट ।

धरी धाय पिय बीच ही, कारी खरी ससूट ॥

ہیر منڈوے گلن لے پری پری سی ٹوٹ

دھری دہائے پیانچ ہی کری کھری رس ٹوٹ

دوہا

ایک شرمیلی نازنین ہنڈولے پر جھول رہی ہے۔ سامنے سے اپنے پیارے پر تیم کو آتے ہوئے دیکھ کر شرم سے گھبرا جاتی ہے۔ اور گھبرا کر اس طرح گرتی ہے جس طرح آسمان سے پری ٹوٹ کر گرتی ہے۔ پر تیم بھی یہ دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور گھبرا کر اس طرح دڑتے ہیں کہ پھرتی سے بیچ ہی میں پک کر دبوچ لیتے ہیں ہماری لال دُور ہی سے یہ تماشہ دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ”واہ بہی واہ بڑی مزے کی ٹوٹ ہوئی۔“

ابا! کیسا مزیدار سین کھینچا ہے۔ اب تمیل کی تمثال ملاحظہ فرمائیے:-

دوہا

कुटिल अलक कूटि परत मुख, वदि गौ इतौ उदोत ।

वकं ववारी देत न्यो, दाम रुपैया हात ॥

کٹیل اک چٹ پرت مکھ بڑہ گوا تو اودوت

بنک بھکاری دیت جیون دام رپیا ہوت

دوہا

کتنا ہی مشوق کے چہرے پر کامل خمدار چھٹ پڑی جس کے بیچ میں حائل ہو جانے سے چاہیے تو یہ تھا کہ شمعِ حُسن پر حجاب آجاتا۔ مگر ہوا یہ کہ حُسن کی ضیاء اور روشنی اس طرح تیز اور اس قدر مچلا ہو گئی کہ جس طرح ایک ”دام“ پر ایک آڑا خط کھینچ دینے سے پورا ایک روپیہ بن جاتا ہے۔

دام ایک پیسے کے ۱/۴ ویں حصہ کو کہتے ہیں اور ہندی میں اُسے اس طرح لکھتے ہیں ”۹“ طلب اسی دام پر ایک اور ترچھا خط اس طرح ”۹“ کھینچ دیا جاتا ہے۔ تو وہ بجائے دام کے پورا ایک روپیہ پڑھا جاتا ہے اب دام ۱۰ روپیہ کے فرق پر نظر ڈالئے کہ وہ کتنا ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں تمثیل کی مثال یعنی تشبیہ کی شبیہ کھینچ کر دکھا دینا۔ اور بھی یک تمثیل اور اُس کے ساتھ شاعر کا قیاس اور اعتقاد ملاحظہ کیجئے۔

دوہا

पिय बिकुरन को दुसहदुख, हरख जात प्यौ साल ।

दुरयोधन लौं देखियत, तजत प्रान यह वाल ॥

پے بکھرن کو دُوسہ دُکھ ہر کھ جات پیو سال

دوہا

دُریو دھن سُم دیکھت تجت پران یہ بال

ناقابلِ برداشت دُکھ تو یہ ہے کہ پیارے پریم سے جدا ہوتی ہے۔ اور خوشی یہ ہے کہ اپنے منکے جا رہی ہے۔ یہ رنج اور خوشی دونوں ایک ہی وقت میں واقعہ ہوئے ہیں لہذا باری لال کہتے ہیں دیکھے کیں اب اسنو یہ نا سمجھ بھولی بھالی دُریو دھن کی طرح اپنی جان دیدے۔

یہ دوہا روایت طلب ہے۔ اس میں دُریو دھن کی موت کی مثال دی گئی ہے۔ دُریو دھن وہ شخص ہے جو مہابھارت کی لڑائی میں پانچوں پانڈوں کا حریف متقابل تھا اس کو ”شراپ“ یعنی بد دھماقتی کہ جب بچہ پر غم اور مُرت ایک ہی وقت میں طاری ہوں گے بھٹیک اُسی وقت تیرا دم نکلے گا۔ چنانچہ جس وقت میدانِ جنگ میں بھیم کی گداسے زخمی اور شکستہ ہو کر دُریو دھن خاک پر گر کر اتوبت عرصے تک اُس کا دم نہیں نکلا۔ آخر جب سامنے سے اسنو تھاں کو پانچ پانڈو پتروں کے سر کاٹ کر لاتے ہوئے دیکھا تو فرطِ مُرت سے کھل اٹھا

لے یعنی پانڈوں کے پانچ بیٹے

اور سمجھا کہ میرے پانچوں دشمن مارے گئے انتقام پورا ہو گیا۔ مگر جب قریبے دیکھا تو نہایت صدمہ ہوا۔ کیوں کہ معلوم ہو گیا کہ آشتی مانے دھوکا کھایا اور بجائے دشمنوں کے دشمنوں کی اولاد ماری گئی۔ بس ٹھیک اسی وقت دم نکل گیا۔

یہ واقعہ شاعر کے ذہن میں ہی اور اُس کے نزدیک گویا یہ قاعدہ کلیہ ہو گیا ہے کہ جب کسی کو مسرت و غم تو اُم لاقی ہوا کرتے ہیں تو اُس کا دم نکل جا یا کرتا ہی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ یہ بھولی بھالی کم سن نازنین جس کے دل اپنے پریتم کی جدائی کا ناقابل برداشت دکھ موجود ہی خوشی سے ہنستی ہوئی اپنے میکے جا رہی ہے۔ کیسے کیا نہو ذریو دھن کسی طرح اس کی بھی جان نکل جائے۔

اس خیال اور مثال میں کتنا پریم بھرا ہوا ہے۔ شاعر نے ایک تاریخی روایت سے اپنا اعتقاد کیسے بھولے پن سے قائم کیا ہے۔ اور پھر اُسے نظم کر کے کتنی صفائی سے باندھ دیا ہے یہی چیز قابلِ داد ہے اور اسی کا نام مضمون آفرینی ہے۔

میرے دوستو! مجھے افسوس ہے کہ میں نے صرف ہماری کارنگ کلام دکھانے میں ہی اپنی تحریر کر ۲۳ صفحے رنگ دیئے۔ شاید چھپنے میں کچھ کم ہو جائیں۔ پھر بھی بہت ہے اگر اسی طرح باقی ماندہ پانچ شعراء کے کلام پھر بھی ریو یو کیا گیا تو ایک رسالے کا مضمون کاہیکو اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔ لہذا اب مجبوراً اختصار سے کام لینا پڑے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مضمون بالائیں کسی قدر طول کلامی ضرور ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ میں ہندی شاعری کی دعوت اپنے ان احباب کو دی رہا ہوں جو ہندی زبان سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے لازم آیا کہ انہیں ایک ایک لفظ کی تشریح کر کے سمجھاؤں۔ اور آئندہ بھی میرے لئے یہ امر ناگزیر ہو گا کہ اس میں شک نہیں کہ میں نے ہماری کے دو ہی ضرورت سے زیادہ منتخب کر لئے۔ آئندہ میں صرف ایک ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دو مثالوں پر اکتفا کروں گا اور وہی کافی ہو گا۔ بقول شخصے مشے نمونہ از خروارے۔

باقی آئندہ

صَلَح رِسمِ اِخط

اذ

(جناب سید احمد علی صاحب مدرس رنہ و سلطانہ بھینسہ ضلع نان دیڑ)

مندرجہ عنوان پر سب پہلا مضمون مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کا رسالہ اردو نمبر میں نکلا ہے جس کا مقصد و امور پر شامل ہے۔

(۱) رسم خط کی کیانی

(۲) بعض حروف کی ساخت میں خفیف سی ترمیم تاکہ مبتدی اور اجنبی کو صحت تلفظ میں کوئی دقت نہ ہو۔

رسالہ نمبر ۳ میں اسی مقصد پر دوسرا مضمون مولوی ہاشمی صاحب کا اختلافات کے ساتھ درج ہوا ہے۔

عدم کیانی کی اصلاح کی ضرورت کو لفظ کے جوڑ توڑ میں بتلایا ہے جس کے متعلق آئندہ نمبر میں تنقیدی بحث پیش کی جائیگی۔ حالانکہ کیانی کی ضرورت حرف و اعراب کے رسم خط میں بھی معلوم ہوتی ہے۔

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کی مجوزہ اعرابی تنظیم پر مولوی ہاشمی صاحب کو اعتراض ہے کہ اس میں اعرابی حرکات کا استعمال نزک ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب اول الذکر کی تجویز اس بنا پر ہے کہ اس کے ذریعہ ایک اجنبی اور مبتدی بلا لحاظ سیاق عبارت اعرابی تلفظات پر حاوی ہو جائے۔ اس مقصد میں ہر ایک تلفظ اور اعراب کے لئے ایک جدا گانہ مستقل شکل درکار ہے جس کا تعین رسم خط اردو میں بہت دشوار ہے البتہ طباعت کی حد تک یہ دشواری دور ہو سکتی ہے۔ لیکن روزمرہ کی کتابت میں یہ پابندی زرا دقت طلب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو گا کہ موجودہ رسم خط کی حالت اصلاح طلب ضروری ہے۔

رسم خط اعرابی

(متعلق بہ حرف و اعراب)

اعراب کی تقسیم دو طرح سے ہے۔ اعراب بالحرکت۔ اعراب بالتحرف، جب اعراب کی تقسیم حرکت و حرف کے نام سے جدا جدا تسلیم کر لی گئی ہے۔ تو ایک دوسرے کی آمیزش کا استعمال خلاف اصول معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اعراب بالحرک میں حرکت کی آمیزش نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حرکت کا نشان مستقل شکل میں نہیں ہے۔ جو شبہ بیزقلم کی روانی میں قائم نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اس کے اعراب بالحرک ایک مستقل شکل واقع ہوتی ہے۔ جو تحریر کی روانی میں قائم رہ سکتی ہے۔ مگر حرکت کا ساتھ چھوٹ جانے سے اعراب بالحرک کا تلفظ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں حرکت کا التزام ہونے پر بھی تلفظ کی صحت بعض اوقات قابل اعتبار نہیں رہتی ہے۔ جیسے ”سیون“ کا تلفظ (س یون) ہو جاتا ہے اگر حرکات و سکنات سے لفظ کی شکل لادی جائے تو روانی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر بھی صحت لفظی کی توقع اصولاً بہت کم ہو جاتی ہے جیسے سینون مگر اصولاً اعرابی حرف کی شکل جو بذاتہ کسی طرح بھی محفوظ ہو نہیں سکتی ہرگز جزم کا نشان نہیں پاسکتی ہے۔ اسی طرح مختلف تلفظ کے دو لفظ (واو اعرابی و ملفوظی کے) سور۔ سور اور روسے اور روسے (رے۔ وے) کی کتابت میں باہمی تلفظ کا امتیاز کسی طرح بھی پایا نہیں جاتا ہے۔ یہ مشکلات صرف اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ حرف اور اعراب کے نشان ایک ہی شکل میں واقع ہو گئے ہیں۔ جن میں حرفی اور اعرابی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ ہاں ایک طریقہ امتیازیہ قرار پاسکتا ہے کہ اعرابی حرف بعد میں واقع ہو تو وہ اعراب ہے ورنہ حرف۔ مگر اس طریقہ کی مطابقت میں ایک ہی شکل حرف الف کی ہے کہ جس کا ایک ہی اعراب مقرر ہے بخلاف اس کے واورسی کا مختلف اور متعدد اعرابوں میں استعمال ہے۔ معروف۔ مجہول۔ ماقبل مفتوح اور معدول علاوہ بریں یہی اشکال مخلوط بھی ہوتے ہیں اور ملفوظ بھی جیسے کیا۔ خوب۔ اودھ۔ پھور۔ سیر۔ پیمیر

پس انہی مشکلات و خصوصیات کے احساس پر مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب نے واوی اعرابوں کا واؤ کے مستقل اشکال مختلفہ میں اور یائی اعرابوں کا خود اسی کے نقطوں کے ہیر پھیر اور نشیب و فراز سے ایک جداگانہ امتیاز قائم فرمایا ہے جو نہایت ضروری ہے مگر ان کی مرتبہ اعرابی تنظیم میں بھی نقائص حالیہ کا تذکرہ کما حقہ نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ نسبتاً اضافہ کا احتمال ہے۔ جس میں خوش نمائی، صحت لفظی اور روانی کے امتیازات یک نخت نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ واؤ مچول کی تشکیل (و) روائی میں مستقل نہیں رہ سکتی ہے۔ اور صورت میں (ف) سے مشتبہ ہو جاتی ہے۔ واؤ ماقبل مفتوح کی تصویر (و) سے مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ لفظ (وہ) کا رسم خط موصول ہے۔

واؤ کی معمولی شکل درمیان یا اخیر میں واؤ معروف اور واؤ ملفوظ دونوں کا کام نہیں دے سکتی اور نہ معدول و مخلوط کا اظہار کر سکتی ہے۔ رَوی اور رِوی کا مختلف تلفظ مرتبہ تنظیم مذکور کی صورت (روی - روی) میں میسر نہیں ہوتا اس تنظیم میں جمع مکسر وادی کی تحریر کے لئے کوئی خاص صورت قابل امتیاز پائی نہیں جاتی جیسے ہندو سے ہندؤں ایسے ہی ایک لفظ واؤ ملفوظی کا واؤ کی معمولی شکل سے جو کہ معروف کی آواز کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ تلفظ میں کچھ کا کچھ ہو جائیگا جیسے (او وہ) کا تلفظ اُو وہ ہوگا اور سیون کا تلفظ سیون (واحد منکلم)

اسی طرح یائے معروف کے امتیاز کے لئے دو عرضی نقطوں کا اتصال اور یائے مجہول کے لئے ایک عرضی خط اور ماقبل مفتوح کے لئے دو طولانی نقطوں کا تعین قرار دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نقطوں کا تعین محض حرفی کے لئے مخصوص ہے۔ نہ کہ اعاب کے لئے اور نقطوں ہی کے تعین و تعدد سے مختلف الصوت حروف کی اشکال میں اختصار و امتیاز کا کام لیا گیا ہے جس سے ایک ہی شکل (بَ حَ دَ رَ سَ صَ عَ) کے حروف مختلف اصوات میں ملفوظ ہوتے ہیں۔ حروف تہجی کی تقسیم بھی نقطوں ہی پر ہوئی ہے۔ منقوط - غیر منقوط - غرض کہ اس نحیف البتہ وجود نقطہ پر اختصاری اور امتیازی بار آنا ڈالا گیا ہے کہ اُس کے سر سے اونچا اور جان سے بڑھ کر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم صورت الفاظ کے تلفظ میں صحت کے لئے پڑ گئے ہیں۔ جیسے

[بنی - بنی + نبات - نبات] کی اشکال ہیں۔

علاوہ ازیں عرضی نقطوں کا اتصال اور خط عرضی کا باہمی فرق امتیاز از روئے اصول ہندسہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ نقطوں ہی کے اتصال سے خط بنتا ہے۔ پھر اس کی درمیانی حالت ملفوظی و مخلوطی ہنوز تشریح طلب ہے۔ اور جمع مکسر پائی کا بھی کوئی امتیاز قائم نہیں ہوا۔ جیسے

لڑکی سے لڑکیاں

لہذا زیر بحث رسم خط عربی کی تنظیم حسب ذیل تجویز کی جاتی ہے جو جملہ اش

نقشہ تعریب نمبر ۱

واوی

معروف + ملفوظ	=	و	 (معمولی)
مجمول + مخلوط	=	و	 (سر حلقہ دار)

(وا)

ما قبل مفتوح	=	م	 (سرا نیچے کو مڑا ہوا)
معدول	=	خ	{ گردن کٹی ہوئی دو کشش کی واؤ ہے اور یہ رسم خط مخصوص ہے حرف ما قبل خ سے

معروف	}	رو - کھاو (بہت کھانے والا)
ملفوظ		(درمیانی)
		منفصل ہو تو ما قبل سے - موصول ہو تو مابعد سے دور رہے تاکہ واؤ معروف نہ لے
		تلفظ کا التباس نہ ہو - جیسے اودھ - روے - روی - نول
		(۱)

پون - بھون -

(۲) (آخر لفظ) موصول ہو تو اس پر جزم دیا جائے جیسے
گو - لکھو

(۳) ما قبل اعراب ہو تو معروف و ملفوظ کا تلفظ ایک ہو جاتا ہے جیسے
کھاو - کھو - روو

رت میں واو مجہول کا تلفظ پیدا ہوتا ہے جیسے
آب و ہوا

مجهول - خود - خول }
مخلوط - خواجہ - خواہش }

ماقبل مفتوح - خوف - حمض - کم ن

معدول - خود - خور - خوش - آخوند - خویش

نوٹ (۱) رسم خط اردو میں ضرورت و بلا ضرورت پر کیس واو معدولہ کا تداخل ہو رہا ہے جیسے

مونہ - پہونچ (منہ - پہنچ)

اس سے ضمہ کا وجود معدوم ہو جائیگا۔ تو کسرہ کا اعراب خواہ مخواہ زیر دریافت پڑا رہیگا اور اعرابی تلفظاً

کے موقع اظہار پر تعلیم مقابلہ میں حرج واقع ہوگا۔

نوٹ (۲) معدول کے لئے معمولی واو استعمال کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کے ماقبل و مابعد کا حصر

ہو چکا ہے۔

واو معدول {
خ و + د
خ و ن + د
خ و + ر
خ و + ز
خ و + ش
خ و ی + ش

نوٹ (۳) معروف - مفوظ - معدول = و + مجهول - مخلوط = و + ماقبل مفتوح م

نقشہ تعریب نمبر ۲

(ریائی)

مجزوہ
دی

مروجہ

یائے معروف آخر لفظ دی

مروجہ	مُجوزہ
یائے مجہول آخر لفظ دیے	دے
ما قبل مفتوح ے ے دی	دی
معروف درمیانی زیر	بیر (ی)
مجهول ے ے بیر	ہیر (ہ)
ما قبل مفتوح ے ے بیر	ہیر (ی)
ملفوظ ے ے	سیر (ی)

الفاظ آخر الیا کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اور کوئی فقرہ کوئی سطر اس قسم کے الفاظ سے خالی نہیں جاتی اس لئے یائی اشکال آخر لفظ مندرجہ بالا کا رسم خط نہایت مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک مفید تر سہولت سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اگر ضرورت اجازت دے تو بنظر سہولت الف واو کی طرح درمیانی (ی) کی اعرابی اشکال بھی مقطوع التحریر تصور کر لی جاتیں مگر اس میں مختصر نویسی کا وصف قائم نہیں رہتا جو رسم خط اُردو کی جان ہے۔

نقشہ تعریب نمبر ۳

یائے مخلوط

حروف مخلوط الیا غیر متحرک اُردو میں جس قدر ملفوظ ہیں وہ یا تو الف کے ساتھ ہیں یا واوی اعراب کے ساتھ۔

جو الف کے ساتھ ملفوظ ہو اس کے امتیاز کے لئے اسی الف کے سرے پر جزم موصول کی زرا سی کشش ظاہر کر دی جائے۔ جیسے

کیا - پیاری - دھیان - گیان

جو واوی اعراب کے ساتھ ملفوظ ہے اس کے امتیاز کے لئے یا ئی نقطوں اور واوی اعراب کا اظہار کافی ہے۔ اُنے سیدھے جزم کا نشان لگانے کی ضرورت نہیں جیسے

کیوڑا - کیوں وغیرہ

الفاظ مخلوط الاعراب میں کوئی حرف مخلوط الیا و مخلوط الوا نہیں ہوتا ہے اس لئے (ری) کو نقطہ اور جزم لگانے کی ضرورت نہیں جیسے

دہو - ہنولا - جیوڑا - لیو (بہت لینے والا)

جیوڑا کا وا معروف ہے اور لیو کا ملفوظ لیکن دونوں کا تلفظ ایک ہے۔

حروف و اور آئی میں سے ہر ایک میں قوت تجاذب اور لطافت اس قدر ہے کہ وہ ساکن ہو کر بھی اپنے ماقبل و مابعد (حروف اعرابی) کے باہمی تلفظ کو مانع ہوتا ہے۔ و اور آئی کا یہ تجاذب ماقبل کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرف ماقبل کی آواز (و-ی) کے تلفظ میں سے ایسی گزر جاتی ہے جیسی کہ روشنی ہوا اور شفاف شیشہ میں سے۔ اس لئے (و-ی) مخلوطی کا امتیاز معمولی جزم سے قائم ہو سکتا ہے۔ مگر وا و مخلوط کے لئے علیحدہ ایک مستقل شکل مشغف ہو چکی ہے۔ اب صرف یا ئے مخلوطی کے لئے جزم کا استعمال رہ گیا ہے۔ نقشہ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

$$\left. \begin{array}{l} (۱) \quad \left\{ \begin{array}{l} \text{خو} = \text{آ} \\ \text{خا} = \text{وا} \end{array} \right\} \\ (۲) \quad \left\{ \begin{array}{l} \text{خو} = \text{آ} \\ \text{خا} = \text{وا} \end{array} \right\} \end{array} \right\} \text{ہجاء}$$

$$\left. \begin{array}{l} (۱) \quad \left\{ \begin{array}{l} \text{کی} = \text{آ} \\ \text{ک} = \text{یا} \end{array} \right\} \\ (۲) \quad \left\{ \begin{array}{l} \text{کیا} = \text{آ} \\ \text{کیا} = \text{یا} \end{array} \right\} \end{array} \right\} //$$

$$\left. \begin{array}{l} \left\{ \begin{array}{l} \text{ک} = \text{یو} \\ \text{ک} = \text{یو} \end{array} \right\} \\ \left\{ \begin{array}{l} \text{کیو} = \text{کیوڑا} \\ \text{کیوں} = \text{کیوں} \end{array} \right\} \end{array} \right\} \text{جزم و بلا جزم دونوں طرح ظاہر کر سکتے ہیں}$$

(حروف مخلوطی)

مولوی ہاشمی صاحب کے خیال کے موافق حروف غنہ کی تشکیل و تمثیل پر ہر ایک مخلوطی حرف کو الٹا جزم لگا کر ایک قاعدہ کی تحت میں نہیں لایا جاسکتا ہے ورنہ تمام مخلوطی حروف غنہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ اُلٹا جزم محض حرف غنہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یا نون غنہ خود نون مخلوط ہو جائے گا۔ جیسا کہ ذنہ کا مخلوط حرف ہندی میں موجود ہے۔ مخلوط حرف کا ہر ایک جز کم و بیش تلفظ کے ساتھ جدا گانہ ملفوظ ہوتا ہے۔ اجزائے مخلوط کے تلفظات میں (۱) کی نسبت ہوا کرتی ہے یعنی مقدم کا تلفظ تالی سے بہت کم ہوتا ہے مگر حرف غنہ میں مقدم ملفوظ ہے اور تالی غیر ملفوظ اس لئے نون غنہ جزو مخلوط نہیں۔ رسم خط اردو کا نون غنہ وہ نہیں ہے جو عربی میں بصورتہ (یا ن وئی) تون یا نون ساکن ماقبل (و-ی) مشد، ملفوظ ہے۔ اردو میں نون غنہ حرف نہیں بلکہ ایک مخرج نامی انتقال مخرج کی ایک علامت (شکل حرف بلا نقطہ) ہے جس کے ذریعہ ہر ایک حرف کی آواز ساہ یا اعرابی ناک کے مخرج میں منتقل ہو جاتی ہے یعنی مَنہ کا تلفظ ناک کے تلفظ سے بدل جاتا ہے۔

نیر

مفید

ری

رسم

نون غنہ کا مخلوط ہونے سے پہلے کوئی مستقل وجود نہیں جیسا کہ (ہ) مخلوطی کا مخلوط ہونے سے پہلے پایا جاتا ہے۔ حرف غنہ کا جو رد و نسخہ حرف مخلوط کی طرح بالاعراب ہونے کی حالت میں کسی طرح مستقل شکل میں نہیں پایا جاتا اس لئے اس کا شمار مخلوطی حروف میں نہیں ہو سکتا۔

اگر نون غنہ کا کسی حرف کے ساتھ جوڑ لگا کر یا اس کو حرکت بے جا میں رکھ کر اس کی مستقل شکل مان لی جائے تو خواہ مخواہ رسم خط اردو کی تعمیر و تشکیل کچھ سے کچھ ہو جائیگی چنانچہ الفاظ (یاں - یوں اور وان) کا رسم خط یوں ہو جائیگا۔

یٹا - یٹو - وٹا

کے

نوٹ :- نون غنہ بلا نقطہ کے ہو اس پر الٹا جزم کافی ہے پس جب حروف نونی (حروف غنہ) پر حروف مخلوطی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے تو اس کی مخصوص علامت اُلٹے جزم کا استعمال حروف مخلوط کی تخصیص پر حاوی نہیں ہو سکتا اور خود حرف غنہ باعتبار کتابت حرف مخلوط

کشتہ

ہو نہیں سکتا۔

اسی طرح ہائی حرف بھی بلحاظ تلفظ کے مخلوط حرف نہیں ہو سکتا۔

گویہ حرف مرکب مانا اور دیکھا جاتا ہے مگر چونکہ تلفظ میں اس کی آواز ایک مستقل آواز ہوتی ہے اس لئے مستقل آواز کی شکل بھی مستقل ہونی چاہئے نہ کہ مشترک۔

اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ بلا توسط اعراب وسطی ایک وقت میں دو سے زیادہ مخلوط حروف کا تلفظ ہو نہیں سکتا جیسا کہ حروف مخلوط وادی اور یائی کے تلفظات سے ظاہر ہے۔ پس اگر حرف ہائی کو تلفظ میں بھی مخلوط مان لیا جائے تو پھر اصولاً کوئی تیسرا حرف مخلوط اس کے ساتھ تلفظ نہ ہوگا اگر ہوگا تو وہ حرف مخلوط کا جزو ثانی تصور ہوگا اور پہلا حرف مخلوط نہیں بلکہ بلحاظ تلفظ صرف ایک حرف مستقل سمجھا جائیگا جیسا کہ دھیان اور گیان میں ہے جس میں مخلوط کا جزو ثانی (ری) ہے اور جزو اول دھ اور گ۔ پس باعتبار تلفظ کے مخلوط کا ہر ایک جزو منجملہ دو کے ایک مستقل حرف ہوتا ہے اس لئے دھ کا تلفظ مفرد اور مستقل ہے مخلوط نہیں جو حرف آواز میں مستقل ہے وہ شکل میں بھی مستقل ہونا چاہئے نہ کہ مشترک مستقل حرف ہمیشہ (بجز نقطہ) بلا علامت کے ہوتا ہے اگر ایک مستقل حرف علامت دار ہو تو وہ علامت اور اعراب سے لدا اگر خارجی اشکال کا بار بردار ہو جائیگا مثلاً پھول کا سر حرف مضموم (پٹہ) قلم کی روانی میں تمام خارجی اشکال کا منقوط واقع ہوتا ہے مزید براں بچہ اور مبتدی کو ہچالے مڑے کے طومار بے تمیزی میں مبتلا ہو کر سرے سے حرف سازی و حرف بازی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہائی حرف کی کوئی مختص اور مستقل شکل علیحدہ نہ ہوگی تو ایک ہی شکل (د) پر تین مختلف تلفظات کا عمل و استعمال ایک بار گراں ہو جائیگا اور تلفظ کی صحت میں بھی احتمال و التباس کی مداخلت ایک حد تک جائز ہو جائیگی۔ مثلاً

رِطَرہ - زِرہ - زَرہ

ایک ہی شکل (د) کے تین نام ہوتے ہیں مخلوطی - ملفوظی - مختصی

زِرہ کا ہائے ملفوظی اخیر میں ہے۔ اخیر حرف پر جزم کی ضرورت نہیں ہوتی حرف کا اخیر ہونا جزمی حالت سمجھی جاتی ہے تو اس صورت میں ہائے ملفوظی (آخر لفظ) اور ہائے مختصی کی اشکال میں کوئی باہمی امتیاز نہیں یہ بے امتیازی خالی از التباس نہیں۔ یہاں رسم خط کی یکسانی میں تلفظ کی یکسانی کا احتمال قوی ہے۔ اس لئے

یہ امر گزیر ہو گیا ہے کہ ہر ایک (دہ) کی صورت کا رسم خط جدا جدا قرار پائے تاکہ تلفظ میں رفع القباس ہو۔

مختلف آواز کی مختلف صورتیں

(۵)

مخلوطی	ملفوظی	مختفی
ھ	ہ	ع
رِٹھ	زِرہ	زَن
چھ	چہ	رکنی دار بلا شوشہ زیریں (چہ)
نوٹ :- اشکال مذکورہ بالا کا رسم خط فی الحال مروج ہے۔ حرف منفصل کے ساتھ بھی (دہ) مختفی کی شکل پیوستہ ہے۔		

رسم خط اعرابی کی کیسانی

(۱) [۱ - ی]

یک (ی) اور ہر جس کا رسم خط اب تک معین نہیں ہوا ہے وہ اپنی ہر رسم اشکال آخر میں لکھی جا رہی ہے۔ یعنی معروف - مجہول اور ما قبل مفتوح میں جیسے معنی - معنی - معنی - اس کا تعین ضروری ہے۔ اس کی تشکیل اس کے تلفظ کے مطابق ہونی چاہئے۔ یعنی اُس کا تعین شکل الف سے ہونا چاہئے۔ چنانچہ اکثر الفاظ ایسے ہیں جی جن کی کتابت الف اور سی دونوں اشکال میں جاری ہے۔ مگر اصولاً کیسانی لازم ہے۔ پس الف ممدودہ کی کتابت قائم کر لی جائے تو املاکا و بدھاؤ دور ہو جاتا ہے۔

مثلاً

الف مقصورہ		الف ممدودہ	
مَعْنٰی - مَعْنٰی - مَعْنٰی	..	مَعْنٰی	..
عَلَمِدَہ	..	عَلَامِدَہ	..
مَعْرٰی	..	مَعْرٰی	..
مَجْرٰی	..	مَجْرٰی	..
مَوْلِنَا	..	مَوْلَانَا	..
مَدْعٰی	..	مَدْعٰی	..
مِیجٰی	..	مِیجٰی	..

اظهار و حذف (الف)

(۲) وہ الفاظ جو الف کے اظهار و حذف سے دو طرح لکھے جاتے ہیں۔ ان کو محض الف کے اظهار سے لکھا جائے۔

ب حذف الف = ثلث - یسین - استحق - سبحن - رحمٰن وغیرہ
 باظهار الف = ثلاثہ - یسین اسحاق سبحان رحمان

تلفظ کی یکسانی

(۳) جس طرح رسم خط کی یکسانی ایک ضروری چیز ہے اسی طرح اس رسم خط کے تلفظ میں بھی یکسانی ہونا ضروری بات ہے۔ اس لئے الفاظ مندرجہ حاشیہ ۱ سے ۱۲ معروف کے الفاظ کو یاد معروف پر ختم کیا جائے جیسا کہ نمبر ۲ میں ہے۔ کیونکہ وہ مرکب ہیں۔ اُن + ہی - اِن + ہی سے ایسے ہی

یائے مجہول کے الفاظ کو یائے مجہول پر ختم کیا جائے کیونکہ وہ مرکب ہیں۔

اُن + ے - اِن + ے سے یہاں یائے مجہول علامت مفعول ہے۔

اِن لفظوں میں غنہ کی آواز قدرتا پیدا ہو جاتی ہے نون غنہ لگانے کی ضرورت نہیں یہ صرف تلفظ غنہ کے اظہار پر نون غنہ کی زائد کتابت ہونے لگی ہے جس سے یائے معروف و مجہول کا اعرابی امتیاز قائم نہیں رہتا۔ ایسے ہی۔ وہی اور یہی کا رسم خط خلاف اصول کبھی کبھی وہی اور یہی بھی دیکھا جاتا ہے یہ صورت نقص ضرورت شعری میں آسکتی ہے۔

رسم خط کی کیسانی اور اس کا تعین مطابق تلفظ کے

نمبر (۱) مروجہ

اُس
اُسی
اُن
اُنہی
اُسے
اُدھر

مندرجہ حاشیہ الفاظ، متقابل الفاظ ہیں اور سب کا سر حرف الف ہے۔ اگر اعراب کا استعمال ترک کیا جاتا ہے تو تلفظ کی کیسانی اور اس کا تعین قائم نہیں رہتا اور اعراب کے استعمال میں قلم کی روانی رک جاتی ہے۔ جیسا کہ نمبر ایک میں ہے۔

نمبر (۲) مروجہ

اُس
اُسی
اُن
اُنہی
اُسے
اُدھر

اگر واو کا استعمال کیا جاتا ہے تو رکاوٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ سے ظاہر ہے کہ جس میں پہلے تو اعراب کی قوت المضاعف کر دی جاتی ہے پھر علامت نفی کے استعمال سے اس کی تنصیف بھی کی جاتی ہے پھر طول عمل یقیناً قلم کی روانی میں حائل ہو جاتا ہے۔ اگر علامت نفی کا استعمال جلدی میں ترک ہو جائے تو تلفظ مشتبه ہو جاتا ہے۔ مثلاً

اوس (شستم)

نمبر (۳) مجوزہ

اُس
اُسی

یہ اس وجہ سے کہ واو معدولہ کی کوئی خاص شکل معین نہیں اس کا تعین

یائے مجہول کے الفاظ کو یائے مجہول پر ختم کیا جائے کیونکہ وہ مرکب ہیں۔

اُن + ے - اِن + ے سے یہاں یائے مجہول علامت مفعول ہے۔

اِن لفظوں میں غنہ کی آواز قدرتا پیدا ہو جاتی ہے نون غنہ لگانے کی ضرورت نہیں یہ صرف تلفظ غنہ کے اظہار پر نون غنہ کی زائد کتابت ہونے لگی ہے جس سے یائے معروف و مجہول کا اعرابی امتیاز قائم نہیں رہتا ہے ایسے ہی - وہی اور یہی کا رسم خط خلاف اصول کبھی کبھی وہ ہی اور یہ ہی بھی دیکھا جاتا ہے یہ صورت نقص ضرورت شعری میں آسکتی ہے۔

رسم خط کی یکسانی اور اس کا تعین مطابق تلفظ کے

نمبر (۱) مروجہ

اِس	اُس
اِسی	اُسی
اِن	اُن
اِنہی	اُنہی
اِنھ	اُنھ
اِدھر	اُدھر

مندرجہ حاشیہ الفاظ، متقابل الفاظ ہیں اور سب کا سر حرف الف ہے۔ اگر اعراب کا استعمال ترک کیا جاتا ہے تو تلفظ کی یکسانی اور اس کا تعین قائم نہیں رہتا اور اعراب کے استعمال میں قلم کی روانی رک جاتی ہے۔ جیسا کہ نمبر ایک میں ہے۔

نمبر (۲) مروجہ

اِس	اِوِس
اِسی	اِوِسی
اِن	اِوِن
اِنہی	اِوِنہی
اِنھ	اِوِنھ
اِدھر	اِوِدھر

اگر واو کا استعمال کیا جاتا ہے تو رکاوٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ سے ظاہر ہے کہ جس میں پہلے تو اعراب کی قوت المضاعف کردی جاتی ہے پھر علامت نفی کے استعمال سے اس کی تنصیف بھی کی جاتی ہے پھر طول عمل یقیناً قلم کی روانی میں حائل ہو جاتا ہے۔ اگر علامت نفی کا استعمال جلدی میں ترک ہو جائے تو تلفظ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً

اوس (ششم)

نمبر (۳) مجوزہ

اِس	اِس
-----	-----

یہ اس وجہ سے کہ واو معدولہ کی کوئی خاص شکل معین نہیں اس کا تعین

واو تلفظ کی خاص شکل کے ذریعہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ ما قبل اس کے (رخ) ہو

اور ما بعد (د - ر - ش - ند - ی) پس اس کے امتیاز کا طریقہ آسان یہی ہے کہ

الف مضموم کو خط نسخ میں لکھا کریں تو ایک مستقل صورت ہو جاتی ہے جیسا کہ نمبر (۳) میں

ذبح ہے۔ یہ ایک ہی کشش میں لکھا جاتا ہے اور اس کا استعمال بھی خاص خاص صورتوں کے

ساتھ مخصوص ہے۔ جس کے تلفظ میں تبدیلی اور منتہی سب غلطی کر جاتے ہیں۔ پس بروے

اصول ریاضی دو اجزاء کے مجموعہ میں سے جب ایک جزو متمایز ہو جاتا ہے

تو دوسرا از خود مینر ہو جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے متقابل لفظ میں الف مکسور کے انہما میں کسی امتیازی

علامت و صورت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(باقی دارد)

اسی اسی
ون ون
نھی نھی
نھی نھی
ادھر ادھر
نوٹ:- پینکل رسم خط زبر
میں ضمہ موصول کی تصور کی جائے

اصطلاحات نباتات

Abama	لنتار	Acacia	اقاقيا
Abaxial	خارج المصفر	Acajou	کاشو-اکازو
Abelicea	ابلبشيه	Acalepha	کو کلي-کوي-شبک
Abelmoschus	(عربي) ابولمسک	Acanaceous	خاردار-کٹھلا
	(فارسي) مشک دانہ—	Acantha	خار-کانقا
Abies	نروب	Acanthaceao	شو کليله
Abjoint	بند کشائي	Acanthoclados	کت شاخه
Abroma	ناماکول	Acanthopodous	خاريا
Abronia	زيبا	Acanthus	شو کله
Abruptly Acuminate	بے طو، نکيلا	Acalycal	بے کاسه
Abruptly Pinnate	بے طو، پيرلا	Acalyculate	بے کاسه
Abrus	ناعمه	Acanthocarpous	کت پھلا
Abscise	کٹنا	Acanthon	خار-کانقا
Abscission	کٹاؤن	Acaulescent	بے ساق
Absciss Layer	کت پرت	Acapsular	بے غلاف
Absinthium	افستہين	Acarpelous	بے پرچہ-بے نمبر
Abstricted	گزیدہ	Acarpous	بے بر-بے نمبر
Abstriction	گزیدگي	Acauline	بے ساق
Absus	ابسوس	Acaulose	بے ساق
Abutilon	توئہ-ابوطيلون	Accessory Bud	اضافي کلي
Abuta	ابوتا	Accessory Fruit	اضافي پھل

Accessory Shoot	اضافی ذلّا	Aciculate	هتّوز نیلا-سوزندار
Accrescent	بالذده	Acheilous	بے لب
Acer	اسفندان	Achenocarp	بیفاز پهل
Aceraceae	اسفند ایلہ	Achenodium	بیفازینہ
Aceraceous	اسفند ایلمی	Acinaceous	دانہ دار
Acervulus	تودک	Acinaciform	تھونما
Acetabuliform	کاسکمان	Acidaspis	نو کدہال
Acetabularia	کاسکیہ	Acinacifolous	تغیح برگہ
Achariaceae	اکار ایلہ	Acinarius	دانہ پوش
Achariaceae	اکار ایلمی	Aconitum	پچھناگ-بوش
Achene	بیفازہ	Acorus	لریزیہ-شکر ساق
Achenial	بیفازی	Acondylous	بے رباط-بے بند
Achilary	بے لب	Acotyledon	بے فلغہ
Achillea	اکلیزیہ	Acrasia	دشامیز
Achimenes	اکمیز	Acrasiaceae	دشامیز ایلہ
Achlamydeae	بے لبادیہ	Acrasiales	دشامیزیلہ
Achlamydeous	بے لبادی	Acrocarpi	سر نمبرے
Achorion	قشارہ	Acrocarpous	سر نمبرے
Achras	سابو طیہ-اشرس	Acrocomia	سر بال
Achroanthes	بے رنگلہ	Acrodromous	نو کرس
Achyranthes	سبوس گلہ	Acrogen	سر دم

Acrogenous	سرمد سی	Acuminate Leaf	نوکدار پتہ
Acramphibryous	هر کنار دم	Acute Leaf	دهاردار پتہ
Acrobryous	سر نمو	Acuan	اکوان
Aerocarp	سر ثمره	Athyrium	لانرسه
'Acrogamous	سر تخمه	Atropa Belladonna	لفاح قتال
Acrogamy	سر تخمی	Auricula	اژنه
Acrogenic	سرمدی	Autogamy	خود باروری - خود باری
Acrogynous	سرمدی	Autogamic	خود بارور - خود بار
Acropetal	سر جو	Autogamous	خود بارور خود بار
Acrospire	سر پیچ	Autophyllogeny	خود برگ زائی
Acrospore	سر دانه	Autophyte	خود غذا
Aerostichum	زیر تخمه	Azalea	خشکرو
Aerosporous	سر دانی	Azolla	سکهامار
Aerosarcum	سر گرده	Azygospore	طاق بزیره
Aeroscopic	سر بین	Azygosperm	طاق نطفه
Acrostichoid	زیر تخمان	Babiana	مهدونه
Actaea	شهدار	Baccharis	بکروس
Actinomyces	کون کھی	Bacillariaceae	چوبکایله
Actinocarp	کون پهل	Bacillariaceous	چوبکایلی
'Actinodromous	کون دور	Bacillariales	چوبکایله
Aculeate	سوزنگ وار	Baccharoid	بکرتسا

Bacteroid	جرماسا	Basidial	بنایک
Balanophora	بلوطیلا	Basidiolichenes	بنایک خراز
Balanophoraceae	بلوطیلائیله	Basidiomycete	بناکهمبی
Balanophoraceous	بلوطیلائیلی	Basidiomycetous	بناکهمبیلا
Balanops	بلوطمان	Basidiophore	بنایک دار
Balanopsidaceae	بلوطمانایله	Basidiospore	بنایک بزیره
Balanopsidales	بلوطمانایله	Basidiosporous	بنایک بزیری
Balaustion	گلزاره	Basidium	بنایک
Balsam	بلسان	Basifugal	بنافزیز
Balsamea	بلسانیه	Basifugally	بنافزیزانه
Balsameaceae	بلسانیه - بلسانایله	Basidiogenetic	بنافزیز
Balsameaceous	بلسانیلی - بلسانایلی	Basifixed	بناباینده
Balsaminaceae	بلسمیذایله	Basipetal	بناجو
Balsaminaceous	بلسمیذایلی	Bassia	باسیه
Balsamine	بلسمون	Bauera	بوبریه
Barbellate	ریشکدار	Bauhinia	بوهنیه
Barosma	گران بویه	Beaumontia	بوماشیه
Bartonia	برطرنیه	Bebeero	بی بی و
Basella	باسیله	Beggiatoa	بججانیه
Basellaceae	باسیلائیله	Begonia	بکونیه
Basellaceous	باسیلائیلی	Begoniaceae	بکونیاایله

Begoniaceous	بگونایلی	Bitorine	دودره
Belladonna	لفاح	Bignonia	بگنونیه
Benzoin	لوبان	Bignoniaceae	بگنونایه
Berberidaceae	بربرایله	Bignoniaceous	بگنونایلی
Berberis	دارهلد - بوباریس	Bijugate	دوجفته
Berberidaceous	بربرایلی	Bikukulia	دوخدوله
Berchemia	برکیوما	Bilabiate	دولبه
Bergamot	ببگ ارمودی	Billbergia	بلبرجیه
Bertholletia	برطولشهیه	Bilocellate	دو شانگی
Bessara	بسهویه	Bipetalous	دو گلبرگه
Bicarpellary	دو برچی	Bipinnate	دو پریا
Bicollateral	هم جانب	Bipinnatiparted	دو پریا تقیما
Bicollaterality	هم جانبیت	Bipinnatisected	دو پریا کتا
Bicostate	دو پسیا	Bixa	بکسا
Bicrenate	دو دنتیا	Blandfordia	بلنفوریه
Bidental	دو دنتا	Beohmeria	بوسهریه
Bifarious	دو نقطیا	Boerhavia	بوهرهویه
Bitorate	دو وراخه	Boletaceae	پلو طایله

Boletaceous	بلوطا لمی	Bombax	کواس-پنبه
Boletus	بلوطه	Borage	مویه
Bomarea	بوماریه	Boraginaceae	موايله
Bombacaceae	پنبه ايله	Boraginaceous	موايلي
Bombacaceous	پنبه ايلي	Borago	موايلا

تبصرہ

۱۔ مقالاتِ زرّیں

۲۔ جذباتِ فطرت

۳۔ اوراقِ سحر

یہ تینوں ننھے ننھے کتابچے بہت چھوٹی تقطع پر ہیں۔ ان کے مصنف جناب شبیر حسن خاں صاحب پتھر ملیج آبادی ہیں جن اصحاب نے روحِ ادب کو ملاحظہ فرمایا ہی وہ آپ کے طرزِ تحریر سے واقف ہیں۔ یہ کتابچے بھی اُسی رنگ کے اور اُسی کے بچے ہیں۔

مقالاتِ زرّیں

مقولے، حکمت، تجربے اور ذوق کا عطر ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس قسم کی چیزیں لکھی ہیں مگر دنیا میں بہت ہی کم بلکہ گنتی کے چند ہی ایسے حکیم منش ادیب ہوئے ہیں جنہیں کامیابی ہوئی ہے۔ اور جن کے مقولے زبانِ زدِ خاص و عام اور مقبولِ خلاق ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یا جہاں کہیں فارسی رائج ہے۔ یہ بلندِ سعادی سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہیں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے مقولے ادبِ حکمت کی جان ہیں اسی طرح فرانس میں پاسکل (Pascal) کو اور انگلستان بیکن و ٹیکپیئر کو یہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ حضرت جوش

۷۵ جذباتِ فطرت صفحات ۱۴ قیمت ۳ ر

۱۷ مقالاتِ زرّیں صفحات ۴۰ قیمت ۱۱ ر

۷۷ اوراقِ سحر صفحات ۳۰ قیمت ۵ ر

ملنے کا پتہ :- رئیس امد خاں صاحب رئیس ملیج آباد۔ لکھنؤ

نے بڑی کٹھن منزل میں قدم رکھا ہے۔ ایک پرہوش نوجوان شاعر یا ادیب کو اس سرزمین پر پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ اس کے لئے علاوہ شاعر یا ادیب یا صاحب ذوق ہونے کے پختگی اور تجربہ بھی شرط ہے۔ عمر کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو دلوں میں گھر کر سکے اور عام و خاص میں درجہ قبولیت کو پہنچ سکے۔ اس کے سوا طرزا د میں بھی شیرینی، لطافت اور ندرت درکار ہے۔ تاہم حضرت جوش کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ جو چیزیں انھوں نے اپنا دل خوش کرنے کو لکھی ہیں وہ اُن کے بعض دوستوں کے لئے بھی موجب مسرت ہوں گی۔ کم سے کم یہ ضرور ہے کہ نیا یقین ادب کا آدھ گھنٹہ مزے سے گزر جائے گا۔ مگر انھیں وہ رتبہ نصیب نہیں ہو سکتا جس کی مصنف کو آرزو ہے۔ ہنوز دلی دور است۔ ابھی انھیں بہت مشق تجربہ اور اصلاح ذوق کی ضرورت ہے۔ اس مجموعہ میں کل مقولے (جن میں سبے چھوٹا آدھی سطر کا اور سبے بڑا تین سطر کا ہے) ۲۶ ہیں ان میں بعض اخلاقی نکتے ہیں کچھ تخیل کی جولانیاں کچھ معمولی خیالات ہیں جنھیں شاعرانہ طرزیں ادا کر دیا گیا ہے اور کچھ شاعرانہ تشبیہیں ہیں اور بعض بالکل سہاٹ ہیں۔ ہمارے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے جملوں (یا مقولوں) کو اس مجموعہ میں داخل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

۱۔ بے سرو سامانی میری محافظ ہے۔

۲۔ سلطنت جمہوری اچھی

۳۔ پلک میں قوت حکمرانی کا پیدا ہو جانا جمہوری سلطنت کی تمہید ہے۔

ان میں نہ کوئی خیال کی خوبی ہے نہ بیان کی۔

آخر میں ہم نمونے کے طور پر چند مقولے دیتے ہیں جن کا پڑھنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اُن کو بہترین مقولوں میں سے ہیں۔

دولت بہت سے ذائقے خراب کر چکی ہے، کیس چمک نہ لینا۔

پہلے دنیا ماں کی طرح تھپکتی ہے اور سو جاؤ تو گلا گھونٹ دیتی ہے۔

غوب روئے تو وہ نظر آنے لگا۔ پانی برس چکا تو دھنک نکل آئی۔ غریب کی عرق آلود پوشانی

پر کوئی بوسہ نہیں دیتا۔

رواج بڑی سے بڑی چیز سے مصافحہ کرا دیتا ہے۔

بعض اس قدر مغرور ہیں کہ راستے میں اگر خدا بھی مل جائے تو وہ سلام طلب کریں۔

”آسانیاں“ دراصل جھیس بدلے ہوئے ”مشکلیں“ ہیں۔

جھوٹے کا آغاز اس قدر بلند ہوتا ہے کہ لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ لیکن انجام میں لوگوں کو

غاروں میں جھک جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔

تمام دنیا کے بہترین پھول۔ اور بہتر سے بہتر استادوں کے بنائے ہوئے عطر وہ خوشبو پیدا نہیں کر سکتے

جو برسات کا پہلا چھینٹا پیدا کرتا ہے۔

کوئی جانور یا قابل مضحکہ اور شایانِ تمسخر نہیں جس طرح ایک مغرور مجتہد۔

جسے تو سرشتِ مسرت سمجھ کر مضبوط پکڑے ہوئے ہے وہ تو دراصل اژدہ کی دُم ہے۔

آدمی کے تین مُخ ہوتے ہیں (۱) جیسا وہ اپنے کو سمجھتا ہے (۲) جیسا لوگ اُسے سمجھتے ہیں۔

(۳) جیسا وہ خود ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے اسی خیال کو کس خوبی اور نزاکت سے ادا کیا ہے اور اسی سے طرزِ بیان کا فرق

معلوم ہو جاتا ہے۔

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں

اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

جذباتِ فطرت

شاعر نے اس میں یہ راز بتایا ہے کہ کائنات کی ہر شے شاعر کو اپنی طرف بلا رہی ہے اور مظاہرِ قدرت

اُسے اپنی دلی آویزیوں کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔ چنانچہ اس خیال کی بنا پر انھوں نے پہاڑ کی صدا

دریا کی صدا، طلوعِ سحر کی صدا، غروبِ آفتاب کی صدا، تارہٴ سحر کی صدا، شفق کی صدا، چاند کی صدا،

آفتاب کی صدا، آدمی رات کی صدا، فصلِ گل کی صدا، سمندر کی صدا، پھول کی صدا کے نام سے چار

چار مصرعوں کی نظمیں لکھی ہیں! اور ہر ایک کے آخر میں پانچواں مصرعہ یہ ہے۔ ع

ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

نظمیں اچھی خاصی اور دلچسپ ہیں۔ اردو زبان میں بہت غنیمت ہیں۔ نمونے کے طور پر دریا کی صدا نقل کی جاتی ہے۔

مری لہروں میں سبھی کا خزانہ مری رُویں محبت کا خزانہ
مرے دھارے میں عظمت کا ترانہ مری گرداب میں جنگ و چنانہ
ادھر آ اے مرے شاعر ادھر آ

اوراقِ سحر

حضرت جوش صبح کے عاشق ہیں۔ وہ اسے دنیا کی ساری نعمتوں سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اوراقِ سحر کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں ”میں لٹریچر کا اکثر طلوع آفتاب سے قبل ہی شروع کرتا ہوں ان نازک مضامین میں سے جو ان اوراق میں جمع کئے گئے ہیں، اکثر آیتیں طلوع سے پہلے ہی نازل ہوئی ہیں یہ وہ پنکھڑیاں ہیں جو صبح صادق کی چاندنی میں چنی گئی ہیں“

اس کتابچے کے پہلے دو صفحوں میں نظم ہو اور باقی نثر ہے۔ اس میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مگر ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح صبح سے ہے۔ طرزِ تحریر ان کا مخصوص ہے۔ نثر کے سب مضامین وہ اسی طرز میں لکھتے ہیں۔ یعنی ٹیگور کی نقل اڑائی ہے اور کہیں کہیں نبھائی ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی ان سب کتابچوں کی عمدہ ہے۔

رسالہ

صنعت و حرفت (صوبہ اورنگ آباد)

مُصَنَّف

محمد نظام الدین صاحب اسٹنٹ انجینئر اورنگ آباد

یہ کتاب خاصی بڑی تقطیع پر ۹۶ صفحہ کی ہے۔ اس میں صوبہ اورنگ آباد کی صنعت و حرفت کی تاریخی کیفیت

موجودہ حالت اور مختلف صنعتوں اور حرفتوں کی ترکیبیں اور طریقے جو اس وقت تک رائج ہیں درج کئے گئے ہیں جن میں سے بعض خاص بلدہ اورنگ آباد سے مخصوص ہیں۔ علاوہ اس کے ان صنعتوں اور پیشوں کے بیان میں بہت سی مفید معلومات بھی درج ہیں۔ اس کے بعد مولف نے انگلستان کے، ہاکارخانوں کی فہرست دی ہے تاکہ جن پیشہ وروں کو ضرورت ہو خط و کتابت کر کے اپنے پیشہ کے متعلق نئی نئی کھیں منگالیں اور اپنے پیشہ کو ترقی دے سکیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر قابل مولف انگلستان کے علاوہ امریکہ اور دیگر ممالک کے کارخانوں کی فہرست بھی دیدیتے۔ اس میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اس فہرست کے بعد ایک فہرست ایسے اخباروں اور رسالوں کی دی گئی ہے جو خاص خاص پیشوں، صنعتوں یا تجارت سے متعلق ہیں۔ تاکہ پڑھ لکھے پیشہ ور یا شوقین اُن کے مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں اور دنیا میں جو ہر روز نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں اُس سے باخبر رہیں۔ رسالوں کے علاوہ بعض بعض مستند اور مفید کتابوں کے نام بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اخبار و رسائل سب کے سب ہندوستان کے ہیں۔ اگر امریکہ کے رسائل بھی درج فہرست کر دیئے جاتے تو یہ فہرست زیادہ مفید ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ امریکہ ان چیزوں میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ اگر یہ کتاب دوبارہ چھپی تو مولف اس کا ضرور خیال رکھیں گے۔ اس کے بعد ایک فہرست اُن مدارس کی دی ہے جہاں مختلف صنعتیں اور پیشے سکھائے جاتے ہیں۔ اس میں بھی سب درسگاہیں انگلستان یا ہندوستان کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں قابل مولف نے ایک بڑا نقشہ دیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اس میں مختلف پیشہ ور کام کرتے ہوئے دکھائے ہیں۔ تصویریں اچھی ہیں اور ہر تصویر کے ساتھ مختصر پر لطف کیفیت درج ہے۔ اس نقشے کو دیکھ کر ملک کے تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب کی چھپائی اچھی نہیں ہے۔ لائق مولف کا یہ کام اس زمانہ میں قابلِ قدر ہے۔

ہندوستانی گھروں میں تیمارداری

مصنفہ

ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب

کتاب کی جلد اچھی، حروف جلی اور کاغذ عمدہ ہیں اور بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان سلیس اور ہدایات وغیرہ بہت آسان ہیں جنہیں ہر شخص بہ آسانی سمجھ کر عمل کر سکتا اور ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اُسے پورا کرے گی۔ مگر چند امور اصلاح طلب معلوم ہوتے ہیں مثلاً پمپریچر چارٹ صرف ایک ہی ہے اگر کئی ہوں تو زیادہ مفید ہوں گے۔ اگر یہ نقصا دیر کا فی تعداد میں ہیں لیکن ان سولنوں کے لحاظ سے جو اس زمانہ میں ہیں تیسرہ قابل تعریف نہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمہ میں بھی تبدیلی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اسٹرا لائننگ کے معنی میری رائے میں صاف ہے کہ بجائے پاک لکھنے چاہئیں۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ ایک چیز صاف ہو مگر پاک نہ ہو۔ اسی طرح پیر (منہ دھوئے ہوئے) کو نجس کہا جائے تو مناسب ہوگا۔

اسی مضمون کی ایک اور کتاب موسومہ انڈین ہوم رنگ مصنفہ میجر آر جے بلیکم مترجمہ زیرنگرانی علیا حفصہ سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرما نزلے جو پال بھی میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب کتابت پر تبصرہ سے دقیق ہے۔

حیدر علی خاں

ایف آر سی ایس (اڈنبرا) ایم۔ آر سی ایس (انگلینڈ)

ڈسٹرکٹ سول سرجن۔ اوڑنگ آباد

فہرست کتب

(سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو)

البیرونی کلمات فیہی میں ابو یحییٰ بن بیری کا متبہ
تقریب سے مستغنی ہر دسویں صدی کا فاضل ہر گز تجربہ علمی
اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا متحقق معلوم ہوتا
ہی ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ تاریخ
اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی
اس کے حالات زندگی اور کلمات علمی پر مشتمل ہے۔ غیر
فلسفہ اجتماع تالیف ہے اور اس کا موضوع نفع اجتماعی
جماعت کے لئے اعمال و قواعد و داعی کے تحلیل و تشریح
ہی موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور
فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر انگلستان و ہند کے
علماء و انجارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ عہ
قاعدہ و کلید قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد
اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر تعلیمات بھی
نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ

کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جس اصول اور طریقہ پر
اس کی تعلیم ہونی چاہیے اُن کی تشریح کے لئے ایک کلید
تیار کی ہے۔ قاعدہ ۲۔ کلید قاعدہ ۴۔
دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج
میراث اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو و صرفہ و نحو اور احوال
و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب
و غریب نکتات درج ہیں۔ قیمت ۴۔
طبقات الارض اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اردو
دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ کتاب کے
آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست
بھی منسلک کر دی گئی ہے۔ قیمت ۴۔
مشاہیر ایرانیان ر۔ و۔ پلونا مارک لائونز کا ترجمہ ہے سیرت نگار
اور انشا پر از میں اصل کتاب و متبہ و ہزار برس سے

مگر پُر زور اُصول اختیار کیا گیا ہے اور ہر اُصول کی بنیاد
 میں تاریخی افتاد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے
 معلومات میں انقلاب اور ہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
 بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لئے تحویر کی گئی
 ہے۔ قیمت حصہ اول غیر مجلد عم حصہ دوم مجلد عام
مقدمۃ الطبیعیات یہ جمہ ہر مگر انگلستان کے مشہور سائنس
 دان حکیم مکمل کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کا نام کتاب کی کافی
 ضمانت ہے، اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن سائنس
 علم و فضل کا مرقع ہے۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے
 لیے بہت مفید ہے۔ قیمت پندرہ

فلسفہ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور
 نفسی ہے جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت
 یاقوت اور زباں آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے قیمت پندرہ
نکات اشعار ایڈو شاعر کا تذکرہ میر تقی میر کی اشعار
 سے ہے اس میں میر صاحب کی رائے اور زبان کے بعض
 بعض نکات پر غور کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں

صاحب۔ دانی نے اس پر ایک ناقذانہ اور چپ مقدمہ
 لکھا ہے۔ قیمت ستہ

نپولین اعظم ایسٹ کی مستند کتاب اردو ترجمہ
 کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری
 جذبہ کا آخری باب ہے، واقعات کی دوا دیا تو سکندر
 کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان ترجمہ آسان اور علم
 فہم کی مکمل پانچ جلد قیمت پندرہ

فلسفہ تعلیم۔ ہر برٹ اپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ
 تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کا نامہ اور الدین
 معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے تربیت کے زبانی قوانین کا استقار
 صحت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ کتاب لہامی معلوم ہوتی ہے قیمت
رہنمایاں ہند۔ مشہور کتاب پروفیسر آف انڈیا کا ترجمہ شروع
 میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرا
 میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی ہمارا لاج کی
 سوانح اور گوتم بدھ کے پراثر حالات آتے ہیں آخری حصہ
 میں شکر لاج رانج اور امانند کا ذکر ہے قیمت پندرہ

آزیری سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اردو کی تین کتابیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدا کے فضل و کرم سے ہندوستان بھر میں صرف ہی ایک کارخانہ ہے جو تمام مشہور و معروف مصنفین اردو کی مکمل تصانیف کا ذخیرہ رکھتا ہے اور اردو کی تقریباً مکمل وہ کتابیں جو قابل دید کسی جاسکتی ہیں اپنے مغز و قدر و انون کی خدمت میں پیش کرتا رہتا ہے۔ ملک بھر میں جتنی جدید و عمدہ تصانیف شائع ہوتی ہیں وہ کارخانہ ہدایں فوراً منگالی جاتی ہیں اس طرح جو صاحب الناظر ایک انجینی سے معاملت رکھیں گے ان کو انشاء اللہ تعالیٰ اردو کی کسی کتاب کے لیے دوسرے کارخانہ کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہوگی۔ مختصر فہرست درج ذیل ہے بفضل فہرست بنام مصنفین اردو طلب کرنے پر روانہ خدمت عالی ہوگی۔

المعلن :- مینجر الناظر ربک انجینی لکھنؤ

مرزا غالب مرحوم		البطل غلامی	عصر	سرسالی	۱۸	ابن الوقت	عصر	المامون	عصر
اردو معنی عہد ہندی دیوان غلامی کا پیش	۱۷	مولانا آزاد مرحوم		۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳
	۱۸	آب حیات		۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴
	۱۹	در بار اکبری		۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
سر سید خان مرحوم		سخن فارسی	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶
تفہیم القرآن جلد مضامین بی الاطلاق خطبات احمدیہ	۲۷	نیرنگ خیال	۲۸	۲۹	۳۰	۳۱	۳۲	۳۳	۳۴
	۲۸	مکتوبات آزاد	۳۱	۳۲	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷
	۲۹	مجموعہ نظم آزاد	۳۲	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸
مولانا حالی مرحوم		۳۰	۳۱	۳۲	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷
آثار اعلیٰ دید کمل مجموعہ کچر استغاثات ہند	۳۸	۳۹	۴۰	۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵	۴۶
	۳۹	۴۰	۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵	۴۶	۴۷
	۴۰	۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵	۴۶	۴۷	۴۸

منہ الیہ الطابک انجینی لکھنؤ

۱۰	معارف	مولانا ذکاء الدین	ذوب محسن الملک	مولوی چرناغ علی	مولانا اسلم جیراچوی	۱۸
۱۸	اپریل فول	سایح ہندستان کا کل جلد ۱	کامات بنیات ۳ جلد	مضامین الاخلاق	حیات	عصر
	مولوی عبدالغنی درانی	سایح ہندستان کا کل جلد ۲	مضامین تہذیب الاخلاق	تحقیق الہام	حیات جامی	۱۸
	عصر	آئین قیصری	مجموعہ لکچر	اعظم الکلام جلد	علوم عرب	عصر
	کرزہ نامہ	تقلید و عملی احکام	۱۸	مجموعہ رسائل	خواتین	عصر
	صحیفہ فطرت	کتاب الحبث الشوق	۱۸	رسالہ محبوب الارث	۱۲	عصر
	تاریخات عظیم	سید محمود	مولوی احسان الدین	خوجہ مہتمم	اعمال الثقلین	عصر
	فلسفہ امثال	۱۲	۱۸	روزنامہ سیاحت	۱۶	عصر
	تفہیم اللسان	کتاب الطلاق	۱۶	ایک فلسفیانہ لکچر اسلام	۱۲	عصر
	تعلیم الانحطاط	کتاب الشفہ	۱۲	المدینۃ فی الاسلام	عصر	عصر
	اہل عرب کا جبر مقابہ	شرح قانون شہادت	۶۰	مولوی شہید احمد نصاری	مسرتعنا الدین	عصر
	جغرافیہ ریاضیہ	لکچر	۱۲	دعوت اسلام	۱۸	عصر
	جغرافیہ طبیعی	خليفة محمد حسین	۱۸	تحریر المرأة	عصر	عصر
	رسالہ علم تراشب	۱۶	۱۲	المدینۃ الاسلام	۱۶	عصر
	رسالہ علم مساحت	اعجاز التثریل	۱۲	مولوی حبیب الرحمن	مسرتعنا عمر بنی	عصر
	سوانح الحساب	سفر نامہ بریزہ جلد	۱۲	منشی محمد حسن	۱۲	عصر
	مولوی عبدالغنی	سایح پٹنالا	۱۲	ترکون کی معاشر	۱۸	عصر
	البرک	مولانا اشہری	۱۲	ہاجرہ	۱۸	عصر
	نظام الملک علی	حیات انیس	۱۲	مسرتعنا علی خان	۱۲	عصر
	مولوی عزیز مرزا	ایشیائی شاعری	عصر	منشی سعید احمد	۱۲	عصر
	خیالات غریز	نور جان بیگم	۱۸	سیکلات	۱۲	عصر
	دکرم اردو	پتو سلطان	عصر	ڈراما جگدیش پان	۱۲	عصر
		حیدر علی سلطان	عصر	فلسفہ ابن سینا	۱۲	عصر

منیجر النظار باب ایجنسی لکھنؤ

حکیم محمد حسین آبادی		ملوی عبدالعزیز		خواجه حسن نظامی		مولانا راشد الخیر سی		نیاز فتح پوری	
تاریخ اربعین	عصر	کتاب المعارج	عصر	روزنامہ بلا شرقیہ	عصر	صبح زندگی	عصر	جذبات بھاشا	عصر
جلد دوم	عصر	محکمات	عصر	روزنامہ ہندوستان	عصر	شام زندگی	عصر	گیتان علی جلد	عصر
جلد سوم	عصر	تاریخ عرب قدیم	عصر	میلذنامہ	عصر	غیب زندگی	عصر	گوارہ بدن	عصر
جلد چہارم	عصر	علم الحدیث	عصر	مہم نامہ	عصر	نوحہ زندگی	عصر	کیو پڈائیڈ ساکس	عصر
پنجمہ زیریں ششم	عصر	صنائع العرب	عصر	یزید نامہ	عصر	منازال السائرہ	عصر	ریخی سیاح کی کٹاری	عصر
ہفتم	عصر	فلسفۃ القرآن	عصر	طمانچہ بر خانیہ	عصر	جوہر تداست	عصر	سیاکب آبادی	
ہشتم	عصر	مہم کی بختین	عصر	مغل نامہ گیارہویں	عصر	عروس کرلا	عصر		
نہم	عصر	مولانا سلیمان ندوی		کرشن پتی	عصر	الزہراء	عصر	خدیجۃ الکبری	عصر
دہم	عصر			آپ بیتی	عصر	نبت الوقت	عصر	نبت الرسول	عصر
صلح الدین	عصر	ارض القرآن جلد	عصر	جگ بیتی	عصر	سراب مغرب	عصر	سیرۃ المحسن	عصر
نور الدین محمد	عصر	لغات جدیدہ	عصر	خطوط حسن نظامی	عصر	ساک و خونکے اعمال	عصر	جام کوثر	عصر
مولوی انصار اللہ		مکاتیب شبلی جلد	عصر	بیوی کی تعلیم	عصر	مودودہ	عصر	صفدر مرزا پوری	
		اہل بیتہ الہامات	عصر	اتالیق خطوط نویسی	عصر	ماوہم	عصر		
تحریر تموری	عصر	تیسرے عالمہ فرستہ	عصر	چھکالیان رنگیدان	عصر	مولوی بشیر الدین پوری	عصر	نرم خیال	عصر
حالات فلسطینیہ	عصر	مولوی عبدالسلام ندوی		بچوں کی کہانیاں	عصر	تاریخ بجا پور جلد	عصر	مشاطہ سخن	عصر
تاریخ انگریزوں کے خلاف	عصر			اُردو دہلی	عصر	حرز طفلان	عصر	مہاشے پرکاشن پوری	
مولوی محمد اسماعیل انصاری		سیرۃ امام سلم	عصر	اسلام کا انجام	عصر	نشاط عمر	عصر		
		سیرتو عربین و بلغیز	عصر	سیرتہ دہلی	عصر	عصا پیری	عصر	حضرت محمد صلیم	عصر
تمن اسلام جلد	عصر	پروفیسر عبدالغنی		غزالی کا خلاصہ	عصر	حسن معاشرت	عصر	ہما تاج پور جلد	عصر
اسلام الفطرنیہ	عصر			اسرار	عصر	اصلاح معیشت	عصر	مارٹین اور لوتھر	عصر
اسلام و خوش فہم	عصر	سادہ علم انسانی	عصر	پروفیسر شہباز مرحوم	عصر	اقبال و لہن	عصر	خدا اور روح	عصر
فتح اندلس	عصر	بریکے کا فلسفہ	عصر	زندگانی بے نظیر	عصر	بچوں کی دو کہانیاں	عصر	سیتو السورات	عصر
فلسفہ جدیدہ	عصر	عقیدت اسلام	عصر	خیالات شہباز	عصر	اعظم اکرم	عصر	بچوں کی کہانیاں	عصر

اردو

۱۔ انجمن ترقی اردو کا سالہ ماہی رسالہ ہر جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں بنیادی اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا

۳۔ قیمت پچیس سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اردو سے پیچھے

۴۔ تمام خط و کتابت: سکرٹری انجمن ترقی اردو و ادبیات اردو

اوزنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیے

(باہتمام محمد تقی خان شہزادی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

